اوکسفرڈ

اُردو ورثہ

انتخابِ کلام

امیر مینائی

ترتیب و تعارف: معین الدین عقیل

اُردو ورثہ

انتخابِ کلام

امیرؔ مینائی

ترتیب و تعارف: معین الدین عقیل

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس یونیورسٹی آف اوکسفرڈ کا ایک شعبہ ہے۔ یہ دنیا بھر میں
درج ذیل مقامات سے بذریعہ اشاعت کتب تحقیق، علم وفضیلت اور تعلیم میں اعلیٰ معیار کے
مقاصد کے فروغ میں یونیورسٹی کی معاونت کرتا ہے:

اوکسفرڈ نیویورک

اوکلینڈ کیپ ٹاؤن دارالسلام ہونگ کونگ کراچی
کوالالمپور میڈرڈ میلبرن میکسیکوسٹی نیروبی
نیودہلی شنگھائی تیپی ٹورونٹو

درج ذیل ممالک میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کے دفاتر ہیں:
آرجنٹینا آسٹریا برازیل چلی چیک ریپبلک فرانس یونان
گوئٹے مالا ہنگری اٹلی جاپان پولینڈ پرتگال سنگاپور
جنوبی کوریا سوئٹزرلینڈ ترکی یوکرین ویتنام

Oxford برطانیہ اور چند دیگر ممالک میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک ہے۔

پاکستان میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس سے شائع ہوئی۔

پہلی اشاعت ۲۰۱۳ء

ISBN 978-0-19-906692-6

پاکستان میں پکسل گرافکس، کراچی میں طبع ہوئی۔
امینہ سیّد نے اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس
نمبر ۳۸، سیکٹر ۱۵، کورنگی انڈسٹریل ایریا، پی او بکس نمبر ۸۲۱۴،
کراچی۔ ۷۴۹۰۰، پاکستان سے شائع کی۔

تعارف

انیسویں صدی کے آخر میں، جب اردو شاعری کا کلاسیکی دور اپنے عروج پر تھا، جن شخصیات نے امتیاز حاصل کیا، ان میں امیر مینائی کا نام خاصا اہم ہے۔ وہ ۱۸۲۹ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کرم احمد مینائی پندرھویں صدی عیسوی کے ایک معروف صوفی، مخدوم شاہ میناؒ کے اخلاف میں تھے۔ امیر مینائی نے اپنی ابتدائی تعلیم کا آغاز گھر میں اپنے والد سے کیا اور پھر اس وقت کے ممتاز علما و مدرسین سے تعلیم حاصل کی۔ انھیں شاعری کا شوق بچپن سے تھا لیکن اپنے والد کی نصیحت کی وجہ سے عرصے تک شاعری شروع نہ کی۔ حصولِ تعلیم کے بعد اس وقت کے ممتاز شاعر مظفر علی اسیر کی شاگردی اختیار کی اور ان کے ذریعے ریاست اودھ کے حکمراں واجد علی شاہ اختر کے دربار میں پہنچے اور اپنی صلاحیتوں کے باعث انعام و اکرام پایا۔ جب ۱۸۵۶ء میں ریاست پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا تو یہ اکبر آباد چلے گئے جہاں معروف نعت گو شاعر محسن کاکوروی سے قرب نصیب ہوا اور نعت گوئی کے ذوق و فن کو جلا ملی۔

۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں انھیں بھی مصیبتیں برداشت کرنی پڑیں اور ان کا کلام ضائع ہوا۔ اس زمانے میں وہ ریاست رامپور کے دربار سے وابستہ ہو کر رامپور چلے گئے، جہاں جا کر وہ عدالتِ عالیہ کی ملازمت سے منسلک ہو گئے۔ ۱۸۶۴ء میں جب نواب کلبِ علی خاں ریاست کے حکمراں بنے تو انھوں نے امیر مینائی کی کافی قدر افزائی کی اور انھیں اپنا استادِ سخن مقرر کیا اور ''ملک الشعراء'' کا خطاب بھی عطا کیا۔

ریاست رامپور میں امیر نے اپنی زندگی کے ۴۳ سال گزارے لیکن آخری عرصے میں دربار کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے تنگ رہے۔ چنانچہ ایک موقع پر جب ریاست حیدر آباد کے حکمراں میر محبوب علی خاں سے ان کی ایک ملاقات ہوئی اور امیر نے ان کی شان میں ایک قصیدہ لکھا جو انھیں بہت پسند آیا تو محبوب علی خان نے انھیں حیدر آباد آنے کی دعوت دی جو امیر نے قبول کر لی۔ اس طرح وہ ۱۹۰۰ء میں

حیدرآباد منتقل ہو گئے لیکن سفر میں شدید بیمار پڑ گئے اور وہاں پہنچ کر اس قدر علیل رہے کہ میر محبوب علی خاں سے ملاقات بھی نہ کر سکے اور اسی حالت میں رحلت پائی۔

امیر نے نظم و نثر دونوں میں کمالات دکھائے ہیں۔ انھیں اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ سنسکرت اور ہندی سے بھی واقفیت تھی اور مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ موسیقی، رمل، نجوم اور جفر میں بھی خاصا دخل تھا۔ ۱۸۸۵ء میں ایک ماہانہ گلدستہ دامنِ گلچیں کے نام سے ایک عرصے تک نکالتے رہے جو وقفوں وقفوں سے ۱۸۹۹ء تک نکلتا رہا۔ تصانیف میں غیرتِ بہارستان پہلا شعری مجموعہ تھا جو اشاعت کے لیے تیار تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں میں تلف ہو گیا۔ مطبوعہ دواوین میں مراۃ الغیب اور صنم خانۂ عشق معروف ہیں۔ امیر نے فارسی میں بھی شاعری کی اور ان کا ایک فارسی دیوان بھی موجود ہے۔ فارسی نثر میں بھی چند رسالے ان سے یادگار ہیں۔

شاعری سے قطع نظر اردو نثر میں خیابانِ آفرینش سیرتِ رسول اکرم ﷺ پر ان کی معروف تصنیف ہے مگر ان کا ایک اہم کارنامہ تذکرہ انتخابِ یادگار ہے جس میں رامپور میں مقیم شعراء کے حالات اور نمونہ کلام شامل ہے۔ امیر کو لغت نویسی سے بھی خاص شغف تھا۔ اس ضمن میں ان کا سب سے وقیع کارنامہ امیر اللغات کی تدوین ہے، جسے انھوں نے شروع کیا لیکن یہ مکمل نہ ہو سکا۔ جس قدر وہ یہ کام کر سکے اس کی پہلی دو جلدیں ۱۸۹۱ء اور ۱۸۹۲ء میں شائع ہوئیں اور تیسری جلد بہت بعد میں ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی۔

اپنی متنوع نثری تصانیف سے قطع نظر امیر کی اصل شہرت ان کی اردو شاعری ہے جس میں وہ اپنے محاسنِ شعری کے باعث ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں، جن میں زبان و بیان کی جاذبیت اور اسالیب کی انفرادیت کے ساتھ ساتھ خیالات کی ندرت اور احساسات و جذبات کی چاشنی بہت نمایاں ہے۔

ڈاکٹر معین الدین عقیل

حمد و نعت

نہیں خلق ہی میں یہ غلغلہ، تری شان جلّ جلالہٗ
سرِ عرش بھی ہے لکھا ہوا، تری شان جلّ جلالہٗ
تری ذات مالک کُن فکاں، تری ذات خالق انس و جاں
ترے در کے شاہ بھی ہیں گدا، تری شان جلّ جلالہٗ

کرے حمدِ رب ہے، یہ کس کی زباں — نبیﷺ کو ہے اِقرارِ عجزِ بیاں
یہاں طاقتِ نطق پاتا نہیں — کہ کوزے میں دریا سماتا نہیں

جب مدینے کا مسافر کوئی پا جاتا ہوں — حسرت آتی ہے یہ پہنچا میں رہا جاتا ہوں
قافلے والے چلے جاتے ہیں آگے آگے — مدد اے شوق کہ پیچھے میں رہا جاتا ہوں

میں کہوں روضۂ پُرنور رہا کتنی دور، — ساتھ والے کہیں اب آتا ہے اب آتا ہے
دونوں بیتاب ہیں حضرتﷺ کی زیارت کے لیے — دل کو سمجھاتا ہوں میں، دل مجھے سمجھاتا ہے

حلقے میں رسولوں کے وہ ماہِ مدنی ہے — کیا چاند کی تنویر ستاروں میں چھنی ہے

بشر سے حمدِ الٰہی امیر کیا ممکن — پہاڑ اٹھائے کہاں حوصلہ یہ رائی کا

وہی چراغ وہی گل وہی قمر وہی برق — نئے لباس میں دیکھا اسے جہاں دیکھا

خلق کے سرورؐ، شافعِ محشر صلّی اللہ علیہ وسلّم
مرسلِ داور خاص پیمبر صلّی اللہ علیہ وسلّم

نورِ مجسم، نیرِ اعظم، سرورِ عالم، مونسِ آدمؑ
نوحؑ کے ہمدم، خضرؑ کے رہبر، صلّی اللہ علیہ وسلّم

نظر میں وہ جب سے سمائے ہوئے ہیں ہم آنکھوں کو سب سے چھپائے ہوئے ہیں
دل و دیدہ اجڑے ہوئے گھر تھے دونوں یہ سرکارؐ ہی کے بسائے ہوئے ہیں

تصدق اس عنایت پر میں اس اعجاز کے صدقے
کہیں ہوں آپؐ لیکن میں تو اپنے دِل میں پاتا ہوں

کچھ رہے یا نہ رہے پر یہ دُعا ہے کہ امیر نزع کے وقت سلامت مرا ایمان رہے

اوجِ ہمت سے ہوا آپ پہ قرآں نازل فکر بالا ہو تو مضمون نیا ملتا ہے

غزلیات

قریب ہے یارو روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

شبِ وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شب جُدائی کا

نہ اٹھا بوجھ زندگانی کا
کچھ ٹھکانا ہے ناتوانی کا

امیر صانع قدرت کا کھیل ہے دنیا
بنا بنا کے مٹائی ہیں صورتیں کیا کیا

کل ذرا چپ میرے پاس آ کے جو بیٹھا ناصح
میں یہ سمجھا کہیں کم بخت اسے دیکھ آیا

عمرِ برق و شرار ہے دُنیا
کتنی ناپائیدار ہے دُنیا
داغ سے کوئی دل نہیں خالی
کیا کوئی لالہ زار ہے دُنیا
آنے جانے پہ سانس کے ہے مدار
سخت ناپائیدار ہے دُنیا

مرے بس میں یا تو یا رب وہ ستم شعار ہوتا
یہ نہ تھا تو کاش دل پر مجھے اختیار ہوتا
جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی
وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا
ترے تیر کی خطا کیا مری حسرتوں نے روکا
نہ لپٹتیں یہ بلائیں تو جگر کے پار ہوتا
وہ مزہ دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یا رب
مرے دونوں پہلوؤں میں دلِ بے قرار ہوتا

مرے دل کو یوں مٹایا کہ نشان تک نہ رکھا　　میں لپٹ کے رو تو لیتا جو کہیں مزار ہوتا

ہمت ہے شرط، راہِ خدا ہے کھلی ہوئی　　پہنچا وہ جس نے قصد کیا راہِ دُور کا
دیدار کا تو وعدہ وفا ہوگا حشر کو　　ارشاد ہو علاجِ دلِ ناصبور کا
میں خاک بھی ہوا تو ہوا اس کی خاکِ در　　چھوٹا نہ دستِ عجز سے دامن غرور کا

حسنِ مطلق کا ازل کے دن سے میں دیوانہ تھا　　لامکاں کہتے ہیں جس کو وہ مرا کاشانہ تھا
دی گئی منصور کو سُولی ادب کے ترک پر　　تھا اناالحق حق مگر اک حرفِ گستاخانہ تھا
دیر کی تحقیر کر اتنی نہ اے شیخِ حرم　　آج کعبہ بن گیا کل تک یہی بت خانہ تھا
آزما دیکھا اسے سو بار ہم نے اے امیر　　آشنا سے آشنا بیگانے سے بیگانہ تھا

ایک دل ہمدم مرے پہلو سے کیا جاتا رہا
سب تڑپنے تلملانے کا مزہ جاتا رہا
سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی کیا گئی
وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولہ جاتا رہا
کیا بری شے ہے جوانی رات دن ہے تاک جھانک
ڈر بتوں کا اک طرف خوفِ خدا جاتا رہا
نیند بھی فرقت میں کھا بیٹھی ہے آنے کی قسم
خواب میں بھی دیکھنے کا آسرا جاتا رہا
جب تلک تم تھے کشیدہ دل تھا شکوؤں سے بھرا
تم گلے سے کیا ملے سارا گلہ جاتا رہا

نعم البدل دیا مجھے اللہ نے امیر　　دل ہوگیا جو خون تو رنگیں سخن ہوا

سو عکس آئینے میں پڑے اور مٹ گئے — اس گھر میں جو گیا وہ غریب الوطن ہوا
کیسی گھڑی تھی گھر سے جو نکلا تھا میں غریب — پھر دیکھنا نصیب نہ مجھ کو وطن ہوا
اب کے سفر وہ ہے کہ نہ دیکھوں گا پھر وطن — یوں تو میں لاکھ بار غریب الوطن ہوا
خلوت میں تھا تو شاہدِ معنی تھا میں امیر — خلوت سے انجمن میں جو آیا سخن ہوا

وہ چھیڑنے کو مرے مسکرا کے کہتے ہیں — کہاں چمک کے یہ بجلی گری خبر لینا
امیر جاتے ہو بت خانے کی زیارت کو — پڑے گا راہ میں کعبہ سلام کر لینا

اُچھلتا ہے کلیجہ ڈوبتا ہے دل خدا حافظ
سمندر پیرنا ہے جھیلنا شبہائے ہجراں کا

فریاد بھی کرتا ہوں تو اللہ سے اپنے — اس در کے سوا میں کہیں سائل نہیں ہوتا
یہ شعر وہ فن ہے کہ امیر اس کو جو برتو — حاصل یہی ہوتا ہے کہ حاصل نہیں ہوتا

یہ آفتاب ہے گرم اس کی کبریائی کا — کہ ذرّہ ذرّہ ہے آئینہ خود نمائی کا
دراز عمر ہو مشاطۂ تصوّر کی — مزہ وصال کا دیتا ہے غم جدائی کا
طریقِ عشق میں گم ہو کے پہنچے منزل پر — عجیب راستہ سوجھا، ہمیں رسائی کا
یہ کس کی راہ میں کھوئے گئے کہ ہم سے خضر — طریق پوچھتے ہیں آ آ کے رہنمائی کا

جمالِ یار کو کہتے ہو تم کہ ہاں دیکھا — کلیم ہوش میں آؤ ابھی کہاں دیکھا
نکیلی چتونیں آنکھوں میں کیا جگر میں چبھیں — امیر آج عجب نوک کا جواں دیکھا

فراقِ یار نے بے چین ہم کو رات بھر رکھا
کبھی تکیہ ادھر رکھا کبھی تکیہ ادھر رکھا

ترے ہر نقش پا کو رہگزر میں سجدہ کر بیٹھے
جہاں تو نے قدم رکھا وہاں ہم نے بھی سر رکھا

غنی ساتھ دنیا سے کیا لے گیا — مگر جو کسی کو دیا لے گیا
بڑی پیچ در پیچ تھی راہِ دَہر — خدا ہم کو لایا خدا لے گیا
گیا سامنے یار کے میں تو یوں — کہ ہاتھوں سے دل کو سنبھالے گیا
بظاہر رہا مجھ سے غافل مگر — کنکھیوں سے وہ دیکھے بھالے گیا

کہتا ہے دل چھپاؤں گا میں خوب رازِ عشق — آنکھیں یہ کہہ رہی ہیں چھپایا نہ جائے گا
لاکھوں کو خاک میں تو ملا دے گا آسماں — ظالم سے دو دلوں کو ملایا نہ جائے گا

امیر لاکھ ادھر سے اُدھر زمانہ ہوا — وہ بُت وفا پہ نہ آیا میں بے وفا نہ ہوا
قدم حضور کے آئے مرے نصیب کُھلے — جوابِ قصرِ سلیماں غریب خانہ ہوا

تھا دھیان میں نقشہ جو تری جلوہ گری کا — منہ پھیر لیا دیکھ کے رُخ ہم نے پری کا
ہر صبح کو یہ شور ہے مرغِ سحری کا — چونکو کہ زمانہ نہ رہا بے خبری کا

میری طرح نہ اک دن ابر بہار رویا — وہ ایک بار رویا میں لاکھ بار رویا
کیا بے کسی کا عالم میرے مزار پر ہے — جو آ گیا وہ بن کر شمعِ مزار رویا

پوچھی امیر سے کل میں نے جو دل کی حالت ‏ سینے پہ ہاتھ رکھ کر بے اختیار رویا

زائل ہوئی نہ بھیس بدلنے سے بوئے عشق ‏ تصویر میں بھی رنگ ہے رخ سے اڑا ہوا
انسان کی مرگ وزیست نہیں ہے کسی کے ہاتھ ‏ آئے تو کیا جو آپ نہ آتے تو کیا ہوا
پچھتا رہے ہیں خون مرا کر کے کیوں حضور ‏ اب اُس پہ خاک ڈالیے جو کچھ ہوا ہوا

ناوکِ ناز سے مشکل ہے بچانا دل کا ‏ درد اُٹھ اُٹھ کے بتاتا ہے ٹھکانا دل کا
مشربِ عشق میں کیسی ہیں یہ اُلٹی باتیں ‏ دل کے جانے کو کہا کرتے ہیں آنا دل کا

تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا ‏ خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا
دیکھ جو کچھ سامنے آجائے منہ سے کچھ نہ بول ‏ آنکھ آئینے کی پیدا کر دہن تصویر کا

اے برقِ حسنِ یار یہ اچھا ظہور تھا ‏ دیدار کو کلیم تھے جلنے کو طور تھا
جب تک کہ چشم شوق میں وحدت کا نور تھا ‏ جس بام پر نگاہ پڑی کوہِ طور تھا

سرد آہیں جب کسی نے کیں وطن یاد آگیا ‏ چار جھونکے جب چلے ٹھنڈے چمن یاد آگیا
جس جگہ دو گز زمیں پائی کھدی سمجھا میں گور ‏ جب نئی دو چادریں دیکھیں کفن یاد آگیا

جب میں جوان تھا تو مری شاعری تھی پیر ‏ اب شاعری جواں ہے تو میں پیر ہوگیا
عالم تمام اپنی جوانی سے تھا جواں ‏ ہم پیر کیا ہوئے کہ جہاں پیر ہوگیا

کیا تم سے کہوں دل کی خرابی کا میں احوال برباد ہو اللہ گھر ایسا نہ کسی کا

اس غمکدے میں کٹ گئی یوں اپنی زندگی قیدی پہ جیسے روز گزر جائے عید کا

زیست کا اعتبار کیا ہے امیر آدمی بلبلا ہے پانی کا

تصوّر میں زلفوں کے رویا کیا میں بالوں میں موتی پرویا کیا

شوق خلوت میں بھی ہے انجمن آرائی کا آئینہ خانہ ہے گوشہ مری تنہائی کا

مری تربت پہ اگر آیئے گا عمرِ رفتہ کو بھی بلوایئے گا

دھوم تھی ان کی لن ترانی کی کیا کہیں ہم سے سامنا نہ ہوا

صفحۂ دہر پہ صورتِ گر قدرت نے امیر اس کی تصویر وہ کھینچی کہ قلم توڑ دیا

عالم کی سیر آٹھ پہر ہے نصیب امیر خلوت میں بیٹھ کر میں جہاں گرد ہوگیا

ایک ارمان نکلتا ہے تو سو آتے ہیں دل عجب گھر ہے کہ ہرگز نہیں ویراں ہوتا

ہر قدم پر وادیِ وحشت میں کہتا ہے یہ دل المدد اے شوق منزل ہے ارادہ دور کا

یا رب شبِ وصال یہ کیسا گجر بجا اگلے پہر کے ساتھ ہی پچھلا پہر بجا

ہے کشورِ عدم میں خدا جانے سیر کیا　　آیا نہ پھر کے منزل ہستی سے جو گیا

حوصلہ قیس کا فرہاد کا دل پیدا کر　　پھر تو یہ کوہ ہے کس کا یہ بیاباں کس کا

کھیل تھا عمر بھر جو دیکھا تھا　　زندگی کیا تھی اک تماشا تھا

نوجواں لوگ کیا نہیں کرتے　　دل لگایا تو کیا گناہ کیا

قیامت کا اگر ڈر ہے تو یہ ہے　　کہ ہے ہے ہم کو پھر جینا پڑے گا

وہ آئے کھینچ کے تلوار سب کو شاد کیا　　امیر آج بہت ہم نے تم کو یاد کیا

دلبری سے کام ہے ہم کو دل آزاری سے کیا
یار کی یاری سے مطلب اس کی عیّاری سے کیا

آوارہ پھر رہا ہے محبت کی راہ میں　　اِک دل دیا تھا ہم کو خدا نے سو یوں گیا

چکر لگا رہی ہے جو بجلی چمن کے گرد　　مدِنظر ہوا ہے مرا آشیانہ کیا

لاکھوں اس لیلیٰ کے دیوانے تھے راہِ عشق میں
اک مشتِ استخواں کا نام مجنوں رکھ دیا

گل خود تھے بے ثبات گلستانِ دہر میں   گلچیں غریب مفت میں بدنام ہوگیا

آنکھوں آنکھوں میں ہوگئیں باتیں   بے عبارت ادا ہوا مطلب
منہ لگے کون روز ناصح کے   بات سمجھے نہ بات کا مطلب

خشک سیروں تنِ شاعر میں لہو ہوتا ہے   تب نظر آتی ہے اک مصرعۂ تر کی صورت

مجھ سے مسکیں کے پاس رہتا ہے   کتنا مسکیں نواز ہے غمِ دوست

آزماؤ دل کو صاحب آزمانے کی طرح   کروٹیں تم تو بدلتے ہو زمانے کی طرح

یہ میکدہ ہے کہ کوئی طلسم ہے ساقی   جو آئے پیر کی صورت گئے جواں کی طرح

میرے مرتے ہی ملا خاک میں وہ اوجِ جنوں   دشت میں کوئی بگولا نہ اُٹھا میرے بعد
زینتِ محفلِ اربابِ سخن تھا میں امیر   نہ رہی رونقِ بزم شعرا میرے بعد

نوبتِ شاہی سے آتی ہے صدا شام و سحر   اور کر لے چار دن اس دارِ فانی پر گھمنڈ
حال پر اجداد و آبا کے تفاخر کیا امیر   ہیں وہ ناداں جن کو ہے اس قصہ خوانی پر گھمنڈ

قدم کو لغزش زباں کو لکنت ہے رعشہ ہاتھوں کو سر کو جنبش
کدھر گئی ہائے نوجوانی ان آفتوں میں ہمیں پھنسا کر
عبث ہے مغرور تجھ کو نخوت نہیں غریبوں کو تیری پروا
خدا ہے ہر مورِ ناتواں کا جو تو سلیماں ہے تو ہوا کر

سخنوروں سے معاملے میں سوائے ذلت حصول کیا ہے
چمن میں بخشے جو ہم سے بلبل تو ہنس پڑے پھول کھلکھلا کر

شبیہہ مدّنظر ہے کس کی کہ کوئی پوری نہیں اترتی
مٹا دیے صانعِ ازل نے ہزاروں نقشے بنا بنا کر

یہ ظلم سارے ہیں چند روزہ ہے ایک دن انتقام کا بھی
امیر حمام گرم کر لیں فقیر کا جھونپڑا جلا کر

امیر قسمت میں جو لکھا ہے اسی کا ہر روز سامنا ہے
خدا ہے مالک خدا ہے رازق کسی سے ہرگز نہ التجا کر

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر
سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر

کوہ کن کوہ کنی شیوۂ عشاق نہیں
ہے جو عاشق دلِ معشوق میں گھر پیدا کر

رنگ چاہے اگر اس باغ میں آزادی کا
نکہتِ گل کی طرح شوقِ سفر پیدا کر

کون سی جا ہے جہاں جلوۂ معشوق نہیں
شوقِ دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر

اپنی گردش پہ بہت ہے تجھے اے چرخ گھمنڈ
جب میں جانوں کہ شبِ غم کی سحر پیدا کر

عشق بازی کا اگر حوصلہ رکھتا ہے امیر
دل جو لوہے کا تو پتھر کا جگر پیدا کر

ہے وہی دوست جسے جس سے محبت ہو جائے
یہ نہ اپنے پہ ہے موقوف نہ بیگانے پر

نہاں تھا آنا کہ ہو نہ ظاہر عیاں تھا جانا کہ سب ہوں باہر
وہ دل میں آئے امنگ ہو کر گئے تو چہرے کا رنگ ہو کر

امیر اک شہر ناپرساں ہے وہ بزم وہاں تم کیا بناؤ گے بگڑ کر

کچھ ایسی بے خبری چھا رہی ہے الفت میں نہ دل کو میرے خبر ہے، نہ مجھ کو دل کی خبر

شاعر کو فکرِ شعر میں راحت کہاں امیر آرام چاہتا ہے تو مشقِ سخن کو چھوڑ

کیا ہوشربا ہیں تری تلوار کے انداز سیکھے ہے یہ شاید تری رفتار کے انداز
اک جلوے میں غش کر گئے اے حضرت موسیٰ ہوتے ہیں یہی طالبِ دیدار کے انداز؟

ہر مصیبت میں رہی میری شریک یا خدا عمرِ شبِ ہجراں دراز

نیرنگیٔ عالم میں کبھی فرق نہ آیا دیکھا تو وہی صبح وہی شام ہے ہر روز

پیری میں اب باقی کہاں ہوش و خرد تاب و تواں
لوٹا گیا یہ کارواں پہنچے جو ہم منزل کے پاس
گردش جو ہو تقدیر میں کچھ سعی کام آتی نہیں
منزل کچھ آگے بڑھ گئی پہنچا جو میں منزل کے پاس

کسی کے ساتھ نہ سیدھا چلا یہ کج رفتار زمانہ ہے کہ تمہاری نگاہ کی گردش

اے شیخ ہے امیر تو دیدار کا فقیر اس کو نہ کشف کی نہ کرامات کی تلاش

سیدھی نگاہ میں ہیں تری تیر کے خواص ترچھی ذرا ہوئی تو ہیں شمشیر کے خواص

اعضا تمام دیدۂ مشتاق بن گئے نرگس کی طرح ہوں ہمہ تن انتظارِ فیض

مکاں سے ہے نہ کچھ ہم کو ہے لامکاں سے غرض
جہاں حضور ملیں ہم کو ہے وہاں سے غرض
تمہارے جلوے کے مشتاق ہیں جہاں ہو نصیب
زمیں سے کام نہ کچھ ہم کو آسماں سے غرض
تمہاری ذات سے مطلب ہے دین و دنیا میں
نہ کچھ یہاں سے غرض ہے نہ کچھ وہاں سے غرض

حسین کوئی کہاں ہے ایسا کہ ہوں مناسب تمام اعضا
اسی کا گیسو جوابِ گیسو اسی کا عارض جوابِ عارض

ہجوِ مئے کر رہا تھا منبر پر میں جو پہنچا تو پی گیا واعظ

یہ اپنی عمر کا عالم ہے، عہد پیری میں نسیمِ صبح سے جس طرح جھلملائے چراغ

عارض ترے اے گلبدن اک اِس طرف اک اُس طرف
گویا کھلے ہیں دو چمن اک اِس طرف اک اُس طرف
مردہ جو ہیں زیرِ زمیں زندہ ہیں بالائے زمیں
آراستہ ہے انجمن اک اِس طرف اک اُس طرف

افلاس و دولت دونوں سے دنیا میں ہوتا ہے ضرر
اس سانپ کے ہیں دو دہن اک اِس طرف اک اُس طرف
کیا دن تھے دلّی لکھنؤ تھے میر و مرزا سے چمن
یہ دونوں تھے یکتائے فن اک اِس طرف اک اُس طرف

لے گئی عبرت جو کل گورِ غریباں کی طرف مل کے اک اک گور سے ہم دیر تک رویا کیے

لاغر ہوں اس قدر مجھے پہچانتی نہیں رہ رہ کے دیکھتی ہے قضا سر سے پاؤں تک
کروں ضبطِ نفس ہمدم کہاں تک لگی ہے آگ سی دل سے زباں تک

تارے گن گن کے شبِ ہجر بسر کرتا ہوں
کیا کروں خواب کو ہے دیدۂ خونبار سے لاگ
بے طرح حال تمھارا تو میں پاتا ہوں امیر
ہوگئی کیا کسی معشوقِ طرحدار سے لاگ

باغ میں آکر وہ گلرو تازہ دکھلاتا ہے رنگ
گل یہ شرماتے ہیں اک آتا ہے اک جاتا ہے رنگ

انھیں درکار ہے اک چلبلا دل یہ سنتا تھا کہ بجلی بن گیا دل
اُسے دیکھا تصدق کر دیا دل کسی کو کیا مری آنکھیں مرا دل
دہائی بادشاہِ حسن کی ہے ادائیں چھینے لیتی ہیں مرا دل
تڑپ جاتا ہوں میں اٹھتا ہے جب یہ الٰہی درد ہے پہلو میں یا دل

تمھارا ہو نہ ہو اس کی خبر کیا ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا دل
الٰہی ایک دل کس کس کو دوں میں وہاں تو مانگتی ہے ہر ادا دل
تمھیں افسردہ پایا بجھ گیا جی تمھیں پایا شگفتہ کھل گیا دل
امیر اس ناز سے ظالم نے دیکھا نگاہیں یوں اٹھیں وہ لے لیا دل

جو کچھ آنکھوں سے دیکھا ہے وہ اس سے جا کے کہہ دینا
ہمارا حال اے قاصد نہیں تحریر کے قابل

سنتا نہیں وہ دل سے کبھی داستانِ دل کس سے بیاں کرے کوئی دردِ نہانِ دل
بے شبہ اس زمیں سے جدا ہے زمینِ عشق اس آسماں سے ہے الگ آسمانِ دل
تو ہے وہ ماہِ مصر کہ جاتا ہے جس طرف رہتا ہے ساتھ ساتھ ترے کاروانِ دل
رتبے میں وقتِ فکر سکندر سے کم نہیں کرتا ہوں سر جھکا کے میں سیرِ جہانِ دل

چھوڑیں شگوفے آپ ہی بلبل کے سامنے پھر آپ ہی ہنسی سے ہوں بے اختیار پھول
گلیوں میں کوچے کوچے میں پھولوں کا ہے فرش اس درجہ بچھ گئے ہیں سرِ رہ گزار پھول
عالم کو کر لیا ہے احاطہ بہار نے پھیلے ہیں کاشمیر سے تا سبزہ زار پھول

قفس میں آج بہت بے حواس ہے بلبل گلوں کی خیر ہو یا رب اُداس ہے بلبل

حضرتِ دل جو تم ہو پہلو میں مر کے بھی رہ چکے مزار میں ہم

مکانِ دل میں ہے کس کا گزر نہیں معلوم یہ بیخودی ہے کہ گھر کی خبر نہیں معلوم

فصلِ گل آئی ہوا گلزار، جنت بوستاں
بڑھ کے رضواں سے ہے ان روزوں دماغِ باغباں
ہر طرف گلہائے رنگارنگ گلشن میں کھلے
جیسے صبحِ عید یک جا ہوں حسینانِ جہاں
خم نہیں شاخیں درختوں کی ہوا سے خاک پر
کر رہے ہیں سجدۂ شکر خدائے انس و جاں
قم باذن اللہ کہتی آئی گلشن میں بہار
جی اُٹھے جو ہوگئے تھے مردہ دل وقتِ خزاں
جھوم کر آیا ہے ابر کوہساری باغ میں
رقص میں ہے ہر روش طاؤس ہو کر شادماں
جھومنا مستوں کی صورت ہے درختوں کا بجا
نکہتِ گل میں بھی ہے کیفِ شرابِ ارغواں
یوں ہے جنبش میں ہوا سے ہر نہالِ سایہ دار
ہو خراماں جس طرح کوئی حسیں دامن کشاں
جس طرف دیکھو زرِ گل باغ میں انبار ہے
شکلِ فوارہ اگلتی ہے زمیں گنجِ نہاں
غنچہ و سوسن سے کیا ہو شکر احسانِ بہار
وہ زبانِ بے دہن ہے یہ دہانِ بے زباں
مصر کا بازار کہیے باغ کے بازار کو
گل ہے یوسف گرد اس کے بلبلوں کا کارواں

سنتے ہیں آپ سارے زمانے کا دردِ دل کہیے تو میں بھی قصۂ سوز جگر کہوں

کیا رنگ جہاں میں ہو رہے ہیں دو ہنستے ہیں چار رو رہے ہیں
اربابِ کمال چل بسے سب سو میں کہیں ایک دو رہے ہیں
محفل برخاست ہے پتنگے رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
دنیا کا یہ حال اور ہم کو کچھ ہوش نہیں ہے سو رہے ہیں
زانو پہ امیر سر کو رکھے پہروں گزرے کہ رو رہے ہیں

روٹھنا روز کا ٹھہرا ہے تو یہ سن رکھیے روز کے روٹھنے والے کو مناتے بھی نہیں

یہ سمجھ کر بھی ناصح کی بھی سن لیتا ہوں اک نہ اک بات نکل آتی ہے سو باتوں میں

وہ سر سے پاؤں تک تصویر ہیں بے ساختہ پن کی
سنورنے سے بگڑتے ہیں، بگڑنے سے سنورتے ہیں

اے برق تو کبھی تڑپی ٹھہر گئی یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

یار کے اٹھتے ہی برہم ہوگیا سامانِ عشق مے کہیں، مینا کہیں، ساقی کہیں، ساغر کہیں

تصوّر ایک مستِ حسن کا ہے یوں مرے دل میں
رواں رہتا ہے دریا جس طرح آغوشِ ساحل میں

شوخی تھی قیامت تری مستانہ ادا میں   فتنوں نے قدم چوم لیے لغزشِ پا میں

یہ چرچے یہ صحبت یہ عالم کہاں   خدا جانے کل تم کہاں ہم کہاں

عدم کے جانے والے راستے میں کب ٹھہرتے ہیں
جہاں یہ گھر سے نکلے جا کے منزل پر اُترتے ہیں
زمانہ ذرّہ و خورشید سے آئینہ خانہ ہے
مگر اس پر بھی جب دیکھا وہ پردے میں سنورتے ہیں
دلِ پُر آرزو کہتا ہے چل کر خضر سے پوچھو
سفینے قلزمِ امید کے کس گھاٹ اُترتے ہیں
ابھی اے جان تو نے مرنے والوں کو نہیں دیکھا
جیے ہم تو دکھا دیں گے کہ دیکھ اس طرح مرتے ہیں
عجب پردہ ہے پردہ شرمِ عصیاں کا دمِ آخر
اسی پردہ میں ساری عمر کے بگڑے سنورتے ہیں
مدد اے آبِ خنجر رحم کر ان تشنہ کاموں پر
نہ ان کی پیاس مرتی ہے نہ یہ پیاسے ہی مرتے ہیں
چلے ہی جاتے ہیں پیکِ نفس اک عمر گزری ہے
نہ منزل ہے کہیں ان کی نہ رستے میں ٹھہرتے ہیں
مغنی ہی کی میخانہ میں حاجت ہے نہ مطرب کی
شکستِ توبہ کی آواز پر ہم وجد کرتے ہیں
وہ سر سے پاؤں تک تصویر ہیں بے ساختہ پن کی
سنورنے میں بگڑتے ہیں بگڑنے میں سنورتے ہیں

قیامت دور تنہائی کا عالم روح پر صدمہ
ہمارے دن لحد میں دیکھیے کیونکر گزرتے ہیں

خیال آتا ہے پیری میں جوانی خواب تھی گویا
پلک پیچھے جھپکتی ہے یہ دن پہلے گزرتے ہیں

اس شان سے ہم آئے تری جلوہ گاہ میں
مشعل دکھائی برقِ تجلی نے راہ میں

کیا دیر ہے امیر کے عفوِ گناہ میں
اللہ کیا کمی ہے تری بارگاہ میں

اندھیر کر رہی ہے یہ چشمِ سیاہ میں
شوخی کو قید کیجیے نیچی نگاہ میں

دل ہے تباہ قافلۂ اشک و آہ میں
گھیرا ہے آندھی پانی نے بیکس کو راہ میں

توبہ بھی کچھ بھروسہ کے قابل ہے زاہدو
پہنچی ہے ہم سے ٹوٹ کے اب خانقاہ میں

وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں
میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں

کانٹا ہوا ہوں سوکھ کے لیکن نہال ہوں
کھٹکوں گا اور اپنے عدو کی نگاہ میں

افتادگی میں بھی مجھے معراج ہے نصیب
ٹھوکر بھی کھائی ہے تو محبت کی راہ میں

ہم رہروانِ عشق کو محشر کا خوف کیا
پڑتے ہیں ایسے کتنے ہی میدان راہ میں

تو نے تو اے سیاہیِ شب ہائے تارِ ہجر
دھبہ لگا دیا مرے بختِ سیاہ میں

وہ دیکھتے ہیں خونِ تمنا جما کے آنکھ
مہندی لگائی جاتی ہے پائے نگاہ میں

آنکھ اپنی فتنہ ہائے قیامت پہ کیا پڑے
جس کے یہ فتنے ہیں وہ ہے اپنی نگاہ میں

قدرت خدا کی ہے کہ ملیں خاک میں تو ہم
اور سرمہ گھر کرے تری چشمِ سیاہ میں

شاعر کو مست کرتی ہے تعریفِ شعر امیر
سو بوتلوں کا نشہ ہے اس واہ واہ میں

ہے نقش دل پہ صورتِ توحید اے امیر
ہوں محوِ ذکر اشہدان لا الہ میں

یہ عکس کس کے چاند سے چہرے کا پڑ گیا
پانی کو ناز ہے کہ میں یوسف ہوں چاہ میں

سودا و میر دونوں تھے کامل مگر امیر ہے فرق واہ واہ میں اور آہ آہ میں

ہے باغ باغ بلبل جس طرح تو چمن میں پھرتے تھے ہم بھی یونہی خوش خوش کبھی وطن میں
آزاد ہو کے ہم نے ایامِ عمر کاٹے دو چار دن سفر میں دو چار دن وطن میں
کیا جانیے کہ چھوڑا پھولوں نے کیا شگوفہ بلبل پکارتی ہے صیاد کو چمن میں
دیبا حریر قاقم تھا رختِ خواب جن کا زیرِ لحد پڑے ہیں لپٹے ہوئے کفن میں
آوازِ کن جو آئی کانوں میں ہم یہ سمجھے عبرت پکارتی ہے بس رہ چکے وطن میں
یاروں سے اُنس کیسا غربت میں عمر گزری ٹھہرے مسافرانہ دو چار دن وطن میں
راتوں کو مثلِ شبنم چھپ چھپ کے باغباں سے ہر پھول سے لپٹ کر روتا ہوں میں چمن میں
یارانِ رفتہ کا ہے غم اے امیر ناحق چھوٹے ہوئے سفر کے مل جائیں گے وطن میں

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں میں
کہو فلک سے ملائے نہ خاک میں مجھ کو کہ انتخابِ جہاں فخرِ روزگار ہوں میں
امیر جاتی جوانی یہ مجھ سے کہتی ہے خزاں نہ سمجھو مجھے آخری بہار ہوں میں
مرے گناہوں سے ہے تیری مغفرت کی نمود گناہ گر نہ کروں تو گناہگار ہوں میں
زمینِ قصرِ سلاطیں سے آرہی ہے صدا کہ آج منزلِ عشرت ہوں کل مزار ہوں میں
پھر اس کی شانِ کریمی کے حوصلے دیکھے گناہگار یہ کہہ دے گناہگار ہوں میں
بلائیں لیتی ہے پھر پھر کے گردِ نومیدی یہ کس کے در پہ الٰہی امیدوار ہوں میں
بڑے مزے میں گزرتی ہے بے خودی میں امیر وہ دن خدا نہ دکھائے کہ ہوشیار ہوں میں

زاہدو کافی ہے اتنی بات بخشش کے لیے
اس کو شوقِ مغفرت ہے میں گنہگاروں میں ہوں

کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ
اے اسیرانِ قفس میں نو گرفتاروں میں ہوں
بے گناہ ہوں میں چلا زاہد جو اس کو ڈھونڈنے
مغفرت بولی ادھر آ میں گنہگاروں میں ہوں

ہر جگہ تم کو نئی شان سے ہم دیکھتے ہیں ہو کہیں لالہ و گل اور کہیں شمس و قمر
آئینہ خانے میں حیران سے ہم دیکھتے ہیں ہر طرف اپنی ہی صورت ہمیں آتی ہے نظر
یاس کو بھی اسی ارمان سے ہم دیکھتے ہیں دیکھتے تھے رخِ امید کو جس حسرت سے

تصور ایک بحرِ حسن کا یوں ہے مرے دل میں
رواں رہتا ہے دریا جس طرح آغوشِ ساحل میں
ہزاروں قیس مشرب ساتھ پھرتے ہیں بیاباں میں
مرے دل میں خیال یار یا لیلیٰ ہے محمل میں
تڑپتا ہے دل صیاد بھی اس کے تڑپنے پر
قیامت کا اثر ہے اضطرابِ مرغِ بسمل میں
یہی حیرت کا عالم ہے تو نظارہ کہاں مجنوں
نکل بھی آئے محمل سے تو پھر لیلیٰ ہے محمل میں
لگا کر وار اوچھا پھر نہ دیکھا اس طرف تم نے
قضا روتی رہی بیٹھی ہوئی پہلوئے بسمل میں
امیر اس کی تجلی گاہ ہے دنیا جو آنکھیں ہوں
وہی گل ہے گلستاں میں وہی ہے شمع محفل میں

ظاہر میں ہم فریفتہ حسنِ بتاں کے ہیں پر کیا کہیں نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں
یارانِ رفتہ سے کبھی جا ہی ملیں گے ہم آخر تو پیچھے پیچھے اسی کارواں کے ہیں
گھبرا کے جب فراق میں مانگی دعائے وصل آئی صدا یہی تو مقام امتحاں کے ہیں
روشن چراغ برق سے رہتا ہے رات دن چمکے ہوئے نصیب مرے آشیاں کے ہیں
اے ہمتِ بلند ابھی تو کمی نہ کر جلوے جو خاص ہیں وہ ادھر لامکاں کے ہیں
یاں جان پر بنی ہے تجھے ہیں رکاوٹیں اے تیغ یار چل بھی یہ غمزے کہاں کے ہیں
وہ اور وعدہ وصل کا قاصد نہیں نہیں سچ سچ بتا یہ لفظ انہی کی زباں کے ہیں

رہے تصویرِ حیرانی ہم ان کے روبرو برسوں
لبِ خاموش سے کی دردِ دل کی گفتگو برسوں
کرے گا یاد اے غم ہم کو بعدِ مرگ تو برسوں
کھلایا ہے جگر برسوں پلایا ہے لہو برسوں
نہیں اے بے کسی بعدِ فنا کچھ خوفِ تنہائی
رہے گا میری تربت پر ہجومِ آرزو برسوں
فنا کے بعد ایسے بے کسوں کو کون پوچھے گا
مگر اے بیکسی رویا کرے گی ہم کو تو برسوں
امیر اک مصرعِ ترتب کہیں صورت دکھاتا ہے
بدن میں خشک جب ہوتا ہے شاعر کے لہو برسوں
کہاں ہوں گی امیر ایسی ادائیں حور و غلماں کی
رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں

مرے مرقد کو ٹھکرانے قیامت بن کے آتے ہیں
پڑا ہوں میں یہاں آکر تو یوں مجھ کو ستاتے ہیں

حسینانِ جہاں رکھتے ہیں شاید درد کا شیوہ
جگہ دیتا ہے جو دل میں اُسی کا دل دکھاتے ہیں

وہ اٹھی پھر گھٹا وہ برق چمکی وہ بہار آئی
اٹھو رندو چلو واعظ تو یونہی سر پھراتے ہیں

ہماری لغزشوں کی تجھ کو اے زاہد خبر کیا ہے
فرشتے تھامتے ہیں ہاتھ جب ہم لڑکھڑاتے ہیں

گزرگاہِ جہاں خالی نہیں رہتی ہے کثرت سے
تماشا گاہ ہے دیکھو ہزاروں آتے جاتے ہیں

ہماری بے خودی تمہید ہے تیری نمائش کی
مٹا کر نقش ہم اپنا ترا نقشہ جماتے ہیں

امیر افسردہ ہو کر غنچۂ دل سوکھ جاتا ہے
وہ میلے ہم کو قیصر باغ کے جب یاد آتے ہیں

واکر وہ چشمِ دل صفتِ نقشِ پا ہوں میں — ہر رہگذر میں راہ تری دیکھتا ہوں میں
اے انقلابِ دہر مٹاتا ہے کیوں مجھے — نقشے ہزاروں مٹ گئے ہیں تب بنا ہوں میں
افتادگی میں اس سے نہ سمجھو جدا مجھے — سایہ صفت قدم بقدم زیر پا ہوں میں
مانندِ سبزہ اس چمنِ دہر میں امیر — بیگانہ وار ایک کنارے پڑا ہوں میں

اوروں سے تو بے باک سرِ بزم لڑا کیں — عاشق سے ہوئیں چار تو شرما گئیں آنکھیں
اس ناز سے دیکھا کہ بہم کٹ گئے عاشق — اک ایک کو اک ایک سے لڑوا گئیں آنکھیں

تاچند امیر اس چمنستاں کا نظارہ   دل سیر سے اُکتا گیا پتھرا گئیں آنکھیں

جوشِ وحشت مجھے ہر سال بناتا ہے جواں
جب بہار آتی ہے ایامِ شباب آتے ہیں
دھیان بندھتا ہے جو اس عارض و گیسو کا امیر
مستقل لخلخۂ مشک و گلاب آتے ہیں

ہائے وہ دن کہ گزر جاتی تھی شب باتوں میں   اب نہ باتوں میں مزہ ہے نہ ملاقاتوں میں
یہ سمجھ کر کبھی ناصح کی بھی سن لیتا ہوں   اک نہ اک بات نکل آتی ہے سو باتوں میں
چار ادھر لوٹتے ہیں چار اُدھر اے ساقی   مئے کھنچی یا کوئی شمشیر خراباتوں میں
واعظ اب چھیڑ کے رندوں سے سنا کرتے ہیں   کچھ مزہ ملنے لگا ہے انہی صلواتوں میں

وہ تو سنتا ہی نہیں ہے داد خواہی کیا کروں
کس کے آگے جا کے سر پھوڑوں الٰہی کیا کروں
کل گیا تھا پیشِ زاہد سوچتا ہوں دل میں آج
خدمتِ پیرِ مغاں میں عذر خواہی کیا کروں
مجھ گدا کو دے نہ تکلیفِ حکومت اے ہوس
چار دن کی زندگی میں بادشاہی کیا کروں
دھوتے دھوتے آنسوؤں سے ہوگئیں آنکھیں سفید
بختِ بد جاتی نہیں تیری سیاہی کیا کروں
وہ مرے اعمالِ روز و شب سے واقف ہے امیر
پیشِ خالق اب دعائے بے گناہی کیا کروں

کوچۂ یار میں اوّل تو گزر مشکل ہے
جو گزرتے ہیں زمانے سے گزر جاتے ہیں

شمع ساں جلتے ہیں جو بزم محبت میں تری
نام روشن وہی آفاق میں کر جاتے ہیں

اثرِ آبِ بقا خاکِ رہِ عشق میں ہے
وہی زندہ ہیں یہاں آکے جو مر جاتے ہیں

زاہدو تم کو جہاں ہم کو درِ یار پسند
خیر تم جاؤ اُدھر، ہم تو ادھر جاتے ہیں

بہار آئی گھٹا چھائی کھلے بوتل چلے ساغر
نہ تم پرہیزگاروں میں نہ ہم پرہیزگاروں میں

جگر روتا ہے دل کو دل جگر کو طرفہ ماتم ہے
وہ اس کے سوگواروں میں یہ اس کے سوگواروں میں

امیر ان سے نہ بچتی دختِ رز آنکھوں میں پی جاتے
جوانی کا گزر شاید نہیں پرہیزگاروں میں

عالم شگفتہ ہو جو میں آفت رسیدہ ہوں
صبح بہار ہو جو گریباں دریدہ ہوں

اے اہل بزم مجھ کو اُٹھاؤ نہ بزم سے
شمعِ سحر ہوں عمر بپایاں رسیدہ ہوں

اب تک کسی پہ میری حقیقت کھلی نہیں
حرفِ نگفتہ ہوں سخنِ ناشنیدہ ہوں

مطلب خزاں سے کچھ نہ غرض ہے بہار سے
دونوں سے مثلِ سرو میں دامن کشیدہ ہوں

شبنم کے اے امیر ملے ہیں مجھے نصیب
گل ہنس پڑیں چمن میں جو میں آبدیدہ ہوں

ملتا نہیں مکاں سے پتہ لامکان تک
ہم کیا ہوئے نکل کے ترے گھر سے کیا کہیں

ٹھیرا ہے روز حشر پہ دیدار یار کا
اللہ حشر تک دل مضطر سے کیا کہیں

رہے ہیں وصل میں کیا کیا نیاز و ناز کے جھگڑے
کبھی ہم روٹھ کے اُٹھے کبھی وہ من کے بیٹھے ہیں
بگڑ کر جب وہ اُٹھے ہیں تو دل بیٹھے ہیں لاکھوں کے
ہزاروں فتنے اُٹھے ہیں جہاں وہ بن کے بیٹھے ہیں
بڑے ہی قدرداں کانٹے ہیں صحرائے محبت کے
کہیں گاہک گریباں کے کہیں دامن کے بیٹھے ہیں

گم گشتہ دل کی تابکجا جستجو کریں ہاں اور دل ملے تو تری آرزو کریں
یارب وہ ذوق دے کہ ترے مستِ معرفت مستی بغیر بادہ و جام و سبو کریں
کب زاہدوں کو مسئلہ عشق کا ہے فہم نامحرموں سے راز کی کیا گفتگو کریں
ہے غنچہ ساں بہار خموشی میں اے امیر بلبل کی طرح باغ میں کیا ہاؤ ہو کریں

طولِ شبِ فراق کا قصہ نہ پوچھیے محشر تلک کہوں میں اگر مختصر کہوں
سنتے ہیں آپ سارے زمانے کا دردِ دل کہیے تو میں بھی قصۂ سوزِ جگر کہوں

جب خوبرو چھپاتے ہیں عارض نقاب میں کہتا ہے حسن میں نہ رہوں گا حجاب میں
رکھا یہ تم نے پائے حنائی رکاب میں یا پھول بھر دیئے طبقِ آفتاب میں
اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں
ملنے کا وعدہ منہ سے تو ان کے نکل گیا پوچھی جگہ جو میں نے کہا ہنس کے خواب میں

عزیز احباب ساتھی دم کے ہیں پھر چھوٹ جاتے ہیں
جہاں یہ تار ٹوٹا سارے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں

الٰہی کیا علاقہ ہے وہ جب لیتا ہے انگڑائی
میرے سینے میں سب زخموں کے ٹانکے ٹوٹ جاتے ہیں

کہتا ہے کون آہ میں اپنی اثر نہیں — ہاں دل دکھے کسی کا یہ مدِ نظر نہیں
ہم بے قرار لوٹتے ہیں کب سے خاک پر — آسودگانِ خاک تمہیں کچھ خبر نہیں

وہ گلعذار کہ تلتے تھے روز پھولوں میں — انہی کی خاک شریک آج ہے بگولوں میں

اس کی حسرت ہے جسے دل سے بھلا بھی نہ سکوں
ڈھونڈنے اس کو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں
ناز کرنے سے تجھے منع نہیں کرتا میں
پر نہ اتنے کہ اٹھاؤں تو اٹھا بھی نہ سکوں
کوئی پوچھے تو محبت سے یہ کیا ہے انصاف
وہ مجھے دل سے بھلا دیں میں بھلا بھی نہ سکوں

فلک کے دور سے دنیا بدل گئی ورنہ — جہاں بنے ہیں یہ میخانے خانقاہیں تھیں

اے امیر اوّل تو وہ ناآشنا ملتا نہیں — مل گیا جس کو تو پھر اس کا پتا ملتا نہیں
ذبح کرتا ہے تو میرے دست و بازو کھول دے — رحم کر قاتل کہ بے تڑپے مزا ملتا نہیں

کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں — جل اُٹھتا ہے جو یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں

گرچہ دیکھے خواب اچھے سب نے تعبیریں کہیں — وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں

لاکھ محنت کی نہ نکلی وصل کی صورت امیر سامنے تقدیر کے چلتی ہیں تدبیریں کہیں

یہ چرچے یہ صحبت یہ عالم کہاں خدا جانے کل تم کہاں ہم کہاں
جو خورشید ہو تم تو شبنم ہیں ہم ہوئے جلوہ گر تم تو پھر ہم کہاں

دل ٹھہر جائے یہ امید نہیں ایسے بگڑے کہیں سنورتے ہیں

خنجر بکف جو اپنے قاتل کو دیکھتے ہیں دل ہم کو دیکھتا ہے ہم دل کو دیکھتے ہیں
آنکھوں کو بند کرلیں خالق سے لو لگائیں کیوں غرق ہونے والے ساحل کو دیکھتے ہیں

الجھ پڑوں کسی دامن سے میں وہ خار نہیں وہ پھول ہوں جو کسی کے گلے کا ہار نہیں

ناز انداز ادا غمزہ کرشمہ شوخی لے کے آیا ہے پریخانہ پری رو دل میں
حکم ہے ضبطِ محبت کا کہ ہو راز نہ فاش آ کے آنکھوں میں پلٹ جاتے ہیں آنسو دل میں

تیرے وعدہ پہ شاد ہوں کیوں کر اپنی قسمت کو جانتا ہوں میں

راحت کو ڈھونڈھتا ہے عبث تو جہان میں اس کا زمیں میں ہے نہ پتہ آسمان میں
دینی نہ تھی کسی کو جو اے آفریدگار پیدا ہی کیوں کیا تھا خوشی کو جہان میں

اشک سے جب دیکھیے معمور ہیں دونوں آنکھیں ہیں کہ دو ناسور ہیں

راہ صحرا کی جو ہم لیتے ہیں جتنے کانٹے ہیں قدم لیتے ہیں

ہم کو فردائے حشر کا کیا غم کہ شبِ ہجر کی سحر ہی نہیں

رات دن غم پہ غم گزرتے ہیں ہم تو اس زندگی پہ مرتے ہیں

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں رہ گئی ایک نہیں ہاں کا کہیں نام نہیں

دل سے کہتا ہے تصوّر یار کا تو مصوّر ہے تو میں تصویر ہوں

میں جانتا ہوں بلبل جو ہے تری حقیقت اک مشتِ استخواں میں دو پر لگے ہوئے ہیں

وہ انتظار کسی کا کرے جو آپ میں ہو ہم ایک عمر سے اپنی ہی راہ دیکھتے ہیں

جامہ زیبو وہ نمائش بعد مردن کیا ہوئی
پیرہن میں تھی جو سج دھج وہ کفن میں کیوں نہیں

بخت ایسے کہاں ہیں جو کروں یار سے باتیں کرتا ہوں میں شب بھر در و دیوار سے باتیں

شوخی تھی قیامت تری مستانہ ادا میں فتنوں نے قدم چوم لیے لغزشِ پا میں

ہزار طرح کے ہوتے ہیں وہم ہم کو امیر کسی کی آنکھ بھی جب ہم پر آب دیکھتے ہیں

یار کے اُٹھتے ہی برہم ہوگیا سامانِ عیش
مئے کہیں مینا کہیں ساقی کہیں ساغر کہیں

ہم اپنی خاک سے بعدِ فنا یہ کام لیتے ہیں
غبارِ راہ بن کر ان کا دامن تھام لیتے ہیں
رہو تم شوق سے عہدِ شباب و دورِ مستی میں
ہم اپنے سر بلائے گردشِ ایام لیتے ہیں

صورت کو اس کی دیکھ کے سمجھے ہو تم غریب
تم سے کبھی امیر سے باتیں نہیں ہوئیں

ڈراؤں حشر کی فریاد سے تو کہتے ہیں
ہمارے آگے تمہاری وہاں سنے گا کون

واہ رے بیخودیِ شوق کیا خوب سلوک
اس کو جب ڈھونڈھ نکالا تو کیا گم مجھ کو
لالہ و گل ہوں خس و خار ہوں یارب کیا ہوں
ڈوبتا ہوں تو ڈبوتا نہیں قلزم مجھ کو
تجھ کو قاتل ہی کے لعلِ لبِ خنداں کی قسم
نیم جاں چھوڑ نہ اے تیغِ تبسم مجھ کو
میں تو کیا عکس سے وہ آئینہ رو کہتا ہے
پیار کی آنکھ سے دیکھا نہ کرو تم مجھ کو
دھوکا کھائے ہوئے آدم کو زمانہ گزرا
ہنستے ہیں دیکھ کے اب تک لبِ گندم مجھ کو
میں ترا عکس تھا اس آئینۂ ہستی میں
تو نے کیا پھیر لیا منہ کہ کیا گم مجھ کو
اور تھا کون شبِ ہجر مصیبت کا شریک
دیکھتا تھا جو میں انجم کو تو انجم مجھ کو
دیکھتا ہوں کبھی آئینہ تو روتا ہوں امیر
اپنی صورت پہ خود آتا ہے ترحم مجھ کو

اے خوشا وحدت نما کثرت کشا نیرنگِ عشق
دیکھتا ہوں ہر مرقع میں تری تصویر کو
اپنے بسمل کا ذرا شوقِ شہادت دیکھیے
دے رہا ہے کیا گلے مل مل کے دم شمشیر کو
ڈال دی عشاق کی آنکھوں پہ حیرت کی نقاب
واہ کس پردے میں رکھا حسن کی تصویر کو
ناز کیونکر ہو گناہوں پر نہ مجھ کو اے کریم
پیار کرتی ہے تری رحمت مری تقصیر کو

سبزۂ رخسارِ جاناں پر لکھا کیا خوب خط　　چوم لوں پاؤں جو دستِ کاتبِ تقدیر کو

گھر گھر تجلیاں ہیں طلبگار بھی تو ہو　　موسیٰ سا کوئی طالبِ دیدار بھی تو ہو
پردے میں چاہتا ہے کہ ہنگامہ ہو بپا　　اے آفتابِ حشر نمودار بھی تو ہو

تصوّر قید میں ہے اے امیر اک بت کی آنکھوں کا
پری خانہ بنا رکھا ہے میں نے اپنے زنداں کو
میں اک غربت زدہ باقی رہا تھا میں بھی آتا ہوں
مبارکباد دے آئے کوئی گورِ غریباں کو
بہت ہے زور پر دستِ جنوں ناصح الگ رہنا
ترا دامن نہ پکڑے چھوڑ کر میرے گریباں کو
امیر ایسی کہاں قسمت کہ پہنچوں اڑ کے پھولوں تک
کبھی چاکِ قفس سے جھانک لیتا ہوں گلستاں کو

شبِ فرقت دراز ہے دیکھیں　　عمر آخر ہو یا یہ آخر ہو
اتنی وابستگی جہاں سے کیا　　شہر بیگانہ تم مسافر ہو
اوّلِ عشق میں یہ حال امیر　　تم تو آغاز ہی میں آخر ہو

پہلے تم اپنی چتون اپنی نظر کو دیکھو　　پھر جس نے دل دیا ہے اس کے جگر کو دیکھو
حالت مریضِ غم کی کچھ تم ہی جانتے ہو　　ایک ایک غش کو دیکھو، دو دو پہر کو دیکھو

کچھ تسلی دلِ زار تو کرتے جاؤ　　تم نہ آؤ مگر اقرار تو کرتے جاؤ

لو ہم تو آگے جاتے ہیں صحرائے عشق میں — یارو تم اپنے پاؤں سے کانٹے چنا کرو
جب پوچھتا ہوں ان سے دوا دردِ عشق کی — کہتے ہیں پہلے ہوش کی اپنے دوا کرو
کیا قدر ہے فسانۂ الفت کی واں امیر — کہتے ہیں ہم سنیں نہ سنیں تم کہا کرو

اے جنوں لے چل اب وہاں کہ جہاں — یہ زمیں اور یہ آسمان نہ ہو
یوں مٹا الفتِ خدا میں خودی — نام باقی رہے نشان نہ ہو
ہم رہیں تم رہو وصال رہے — غم نہیں ہے جو یہ جہان نہ ہو

وصل کی رات تو راحت سے بسر ہونے دو — شام ہی سے ہے یہ دھمکی کہ سحر ہونے دو
جس نے یہ درد دیا ہے وہ دوا بھی دے گا — لادوا ہے جو مرا دردِ جگر ہونے دو
ہوں غریب اور غریبوں کا خدا والی ہے — ہونے دو سارے زمانے کو ادھر ہونے دو

وہ حسن کیا ہے حسن جو خاطر نشیں نہ ہو — کس کام کا وہ نام جو زیرِ نگیں نہ ہو
ہستی جہاں کی ہستیِ حق پر دلیل ہے — کیونکر جہاں ہو جو جہاں آفریں نہ ہو
سر آستانِ دل پہ نہ پہنچے کبھی امیر — جب تک کہ عرش پر قدمِ اوّلیں نہ ہو

آج محفل سے تم آئے ہو اُٹھانے ہم کو — ہائے وہ دن کہ جو اُٹھتے تھے بٹھانے ہم کو
سات عالم میں یہ شہرت ہے قضا نے مارا — واہ کس پردے میں مارا ہے ادا نے ہم کو

وصال پر جو ہے وصل امتحان کو دیکھو — امیر یوں ہی سہی چند روز مر دیکھو
امیر جلوۂ وحدت سے آشنا ہو جو دل — وہی ظہور وہی شان ہے جدھر دیکھو

کیا بے خبری ہے کہ خبر یار کی مجھ تک آتی بھی ہے تو آپ میں پاتی نہیں مجھ کو
ہے خواب میں آنے کا امیر اس سے جو وعدہ موت ایک طرف نیند بھی آتی نہیں مجھ کو

اے ضبط دیکھ عشق کی ان کو خبر نہ ہو دل میں ہزار درد اُٹھے آنکھ تر نہ ہو
مدّت میں شامِ وصل ہوئی ہے مجھے نصیب دو چار سو برس تو الٰہی سحر نہ ہو

یہ چاہتا ہے تحیر کہ دونوں ہوں تصویر اُدھر جواب نہ ہو کچھ ادھر سوال نہ ہو

ابھی آئے ابھی جاتے ہو جلدی کیا ہے دم لے لو
نہ چھیڑوں گا میں جیسی چاہو تم مجھ سے قسم لے لو

آہ کرنے پہ کیوں بگڑتے ہو تم تو صاحب ہوا سے لڑتے ہو

بھرے آتے ہیں آنسو میرا حالِ زار دیکھو تو اٹھا ہے آج کیا ابرِ دریا بار دیکھو تو

رختِ ہستی بدن پہ ٹھیک نہیں جامۂ مستعار سا ہے کچھ
ساقیا ہجر میں یہ ابر نہیں آسماں پر غبار سا ہے کچھ

تیر پر تیر لگا دیکھ کے او صید افگن لوٹ جائے نہ قضا بھی کہیں نخچیر کے ساتھ
کیا شبیہہِ رُخِ گلگوں نے دکھایا عالم کھنچ گیا رنگ میں نقاش بھی تصویر کے ساتھ
عرصۂ جنگ میں بھی پیجئے مے او ساقی کیا مزہ ہو جو چلے جام بھی شمشیر کے ساتھ

بات سیدھی بھی ہوئی جاتی ہے اُلٹی جو امیر ضد ہے شاید مری تقدیر کو تدبیر کے ساتھ

ساقیِ بزم روزِ ازل نے بادۂ حسن بھرا ہے اس میں
آنکھیں ہیں ساغر شیشہ ہے گردن ماشاء اللہ ماشاء اللہ
واہ امیر ایسا ہو کہنا شعر ہیں یا معشوق کا گہنا
صاف ہے بندش مضموں روشن ماشاء اللہ ماشاء اللہ

چھوٹے جو اپنے ہاتھ سے اس دلربا کے ہاتھ
سارے جہاں سے بیٹھ رہے ہم اٹھا کے ہاتھ

ہے آج جو سرگزشت اپنی کل اس کی کہانیاں بنیں گی

خونِ ناحق کہیں چھپتا ہے چھپائے سے امیر کیوں مری لاش پہ بیٹھے ہیں وہ دامن ڈالے

پوچھتا میں جو مسیحا کہیں مجھ کو ملتے دردِ دل کی بھی تمہیں کوئی دوا کرنی ہے

نہ شاخِ دل ہی اُونچی ہے نہ دیوارِ چمن بلبل
تری قسمت کی کوتاہی، تری ہمت کی پستی ہے

ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے
نہ گل ہیں نہ غنچے نہ بوٹے نہ پتے ہوئے باغ نذرِ خزاں کیسے کیسے
خزاں لوٹ ہی لے گئی باغ سارا تڑپتے رہے باغباں کیسے کیسے

تری بانکی چتون نے چن چن کے مارے　　نکیلے سجیلے جواں کیسے کیسے
یہاں درد سے ہاتھ سینے پہ رکھا　　وہاں ان کو گزرے گماں کیسے کیسے
ہزاروں برس کی ہے بڑھیا یہ دنیا　　مگر تاکتی ہے جواں کیسے کیسے
بنا کر دکھائے مرے دردِ دل نے　　تہِ آسماں آسماں کیسے کیسے
ترے جاں نثاروں کے تیور وہی ہیں　　گلے پر ہیں خنجر رواں کیسے کیسے
امیر اب سخن کی بڑی قدر ہوگی　　پھلے پھولیں گے نکتہ داں کیسے کیسے

گلشن میں سرو، فوج میں مثلِ نشاں رہے　　عالم میں سربلند رہے ہم جہاں رہے
نیرنگ ان کی شانِ تجلّی کے دیکھیے　　اتنے ہوئے عیاں کہ نظر سے نہاں رہے
یوں بیٹھے بیٹھے زیست کے دن ہوگئے تمام　　کشتی میں جیسے ساکنِ کشتی رواں رہے
تا حشر ان کو ناز مبارک مجھے نیاز　　مانندِ عشق حسن بھی یا رب جواں رہے
صیاد ادھر خلاف، ادھر باغباں امیر　　ہم بارِ خاطرِ قفس و آشیاں رہے

اک عمر ہوگئی کہ اقامت سفر میں ہے　　نقشہ مگر وطن کا ابھی تک نظر میں ہے
خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر　　سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

دل میں آکر نہ دل سے پھر نکلے　　تم تو ارماں بن گئے دل کے

اب آوٗ زندگیٔ مستعار جاتی ہے　　کرو نہ غمزے کہ فصلِ بہار جاتی ہے

بے چشمِ مست یار نہیں لطفِ مے کشی　　اب انجمن سے شیشہ و ساغر اٹھایئے

اک ذرا دیکھ تو کیا کہتے ہیں مرنے والے او غریبوں کے مزاروں سے گزرنے والے

عجب دلچسپ نقشہ عالم ایجاد رکھتا ہے
جو آنکھیں دیکھ لیتی ہیں انھیں دل یاد رکھتا ہے

آپ ہی جل رہے ہیں پروانے شمع کی سرگذشت کون سنے

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لیے ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لیے
تند مئے اور ایسے کمسن کے لیے ساقیا ہلکی سی لا ان کے لیے
ہے جوانی خود جوانی کا سنگھار سادگی گہنا ہے اس سن کے لیے
باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی بھیجنا ہیں ایک کمسن کے لیے
ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لیے
وائے قسمت وہ بھی کہتے ہیں برا ہم برے سب سے ہوئے جن کے لیے
کون ویرانے میں لوٹے گا بہار پھول جنگل میں کھلے کن کے لیے
سب حسیں ہیں زاہدوں کو ناپسند اب کوئی حور آئے گی ان کے لیے
وصل کا دن اور اتنا مختصر دن گنے جاتے تھے اس دن کے لیے
لاش پر عبرت یہ کہتی ہے امیر آئے تھے دنیا میں اس دن کے لیے

خودی سے بے خودی میں آ جو شوقِ مے پرستی ہے
جسے تو نیستی سمجھا ہے اے غافل وہ ہستی ہے
سرِ راہِ عدم گورِ غریباں طرفہ بستی ہے
کہیں غربت برستی ہے کہیں حسرت برستی ہے

تری مسجد میں واعظ خاص ہیں اوقاتِ رحمت کے
ہمارے میکدہ میں رات دن رحمت برستی ہے
بڑھ اے آہِ رسا اب کنگرے پر عرش کے پہنچی
بلندی کو بلندی جانا ہمت کی پستی ہے
جوانی لے گئی ساتھ اپنے سارا عیش مستوں کا
صراحی ہے نہ شیشہ ہے نہ ساغر ہے نہ مستی ہے
نہ کوئی شمع لاتا ہے نہ کوئی گل چڑھاتا ہے
مزاروں پر غریبوں کے عجب غربت برستی ہے
امیر اک تختۂ ہموار ہے یہ شعر کا کوچہ
طبائع کے تفاوت سے بلندی اور پستی ہے

پژمردہ گل ہوئے ترے گالوں کے سامنے
سنبل میں پیچ پڑ گئے بالوں کے سامنے
تیروں کے پر کٹے ترے غمزے کے رُوبرو
نبضیں نہ چل سکیں تری چالوں کے سامنے
عاشق نے لاکھ جمع کیا دفترِ حواس
شیرازہ کھل گیا ترے بالوں کے سامنے
کرتے ہیں عجز جن کو خدا نے دیا ہے ظرف
شیشوں کے سر جھکے ہیں پیالوں کے سامنے

رہے وہ جان جہاں یہ جہاں رہے نہ رہے
مکیں کی خیر ہو یارب مکاں رہے نہ رہے
ابھی مزار پہ احباب فاتحہ پڑھ لیں
پھر اس قدر بھی ہمارا نشاں رہے نہ رہے
ہمارے دل سے مٹے گا نہ داغِ شوقِ سجود
جبیں رہے نہ رہے آستاں رہے نہ رہے
چلا تو ہوں پئے اظہار دردِ دل دیکھوں
حضورِ یار، مجالِ بیاں رہے نہ رہے
چلا ہوں کوچۂ قاتل کو سر کے بل دیکھوں
یہ حال دل کا دمِ امتحاں رہے نہ رہے

دو روزہ زیست غنیمت ہے ذکرِ حق کر لے　　بدن میں جان دہن میں زباں رہے نہ رہے
امیر جمع ہیں احباب دردِ دل کہہ لے　　پھر التفاتِ دل دوستاں رہے نہ رہے

ہم جو پہنچے تو لبِ گور سے آئی یہ صدا　　آیئے آیئے حضرت بہت آزاد رہے
کیا عجب بھول گئے ہم جو کلام اپنا امیر　　یاد رہنے کے جو قابل نہ ہو کیا یاد رہے

فنا کیسی بقا کیسی جب اس کے آشنا ٹھہرے
کبھی اس گھر میں جا نکلے کبھی اس گھر میں جا ٹھہرے
دلِ عاشق میں کیونکر عکسِ روئے دلربا ٹھہرے
جمالِ آفتاب آئینۂ شبنم میں کیا ٹھہرے
حقیقت کھول دی آئینہ وحدت نے دونوں کی
نہ تم ہم سے جدا ٹھہرے نہ ہم تم سے جدا ٹھہرے
رہے سائے کی صورت ساتھ ہم ہر شخص کے لیکن
جدا اُٹھے جدا بیٹھے جدا آئے جدا ٹھہرے
صفیں آراستہ ہونے لگیں جب اہلِ محشر کی
جما کر ایک ٹکری حسرتوں کی ہم جدا ٹھہرے
زمینِ کوئے جاناں بھی عجب دلچسپ تختہ تھا
جہاں ٹھہرے ہمارے پاؤں مثلِ نقشِ پا ٹھہرے
امیر آیا جو وقتِ بد تو سب نے راہ لی اپنی
ہزاروں سینکڑوں میں درد و غم دو آشنا ٹھہرے

شبِ غم مجھ سے بیٹھا جائے کیوں کر　　تری تصویر تو آگے کھڑی ہے

نگاہِ ناز ہوتی ہے برآمد سلامی کو صفِ مژگاں کھڑی ہے
تمہارے لب ہیں باغِ حسن کے پھول تبسم ان کی نازک پنکھڑی ہے

عجب ناگن ہے زلف اس کی کہ جس محفل میں کھولی ہے
وہاں سے جو چلا ہے اٹھ کے اس کے ساتھ ہولی ہے
عجب عالم ہے اس کا وضع سادی شکل بھولی ہے
کھبی جاتی ہے دل میں کیا رسیلی نرم بولی ہے
امیر ایسے شگفتہ ہیں مضامیں نازک و رنگیں
غزل کیا ہے یہ پھولوں سے بھری گلچیں کی جھولی ہے
خوشامد اے دلِ بیتاب اس تصویر کی کب تک
یہ بولا چاہتی ہے پر نہ بولے گی نہ بولی ہے
امیر اس بے وفا دنیا کی صورت پر نہ تم جاؤ
بڑی عیار ہے مکار ہے ظاہر میں بھولی ہے

دونوں عالم ہوئے تہ و بالا تم تھے پردے میں کیا قیامت کے
اس کا نقشہ کھنچے تو اے نقاش رنگ بھرنا مری طبیعت کے

ترا کیا کام اب دل میں غمِ جانانہ آتا ہے
نکل اے صبر اس گھر سے کہ صاحب خانہ آتا ہے
ان ہی سے غمزے کرتی ہے جو تجھ پر جان دیتے ہیں
اجل تجھ کو بھی کتنا نازِ معشوقانہ آتا ہے

وہ بت ہے مہرباں سب اپنا اپنا حال کہتے ہیں
لبِ خاموش تجھ کو بھی کوئی افسانہ آتا ہے
امیر اور آنے والا کون ہے گورِ غریباں پر
جو روشن شمع ہوتی ہے تو ہاں پروانہ آتا ہے

نہ مست ہے، نہ کوئی ہوشیار باقی ہے — حجاب کس سے اب اے چشمِ یار باقی ہے
چلے برنگِ نفس عمر بھر تو کیا حاصل — کہ منزلوں میں ابھی کوئے یار باقی ہے
نہ دل میں تاب نہ آنکھوں میں تو رہے لیکن — وہی تڑپ ہے وہی انتظار باقی ہے
قضا پکارتی پھرتی ہے ان کو مقتل میں — چلے اگر کوئی امیدوار باقی ہے
کہاں کہاں نہیں یارانِ رفتہ کو ڈھونڈھا — جو ہے تو ایک عدم کا دیار باقی ہے
نہ تختِ خسروِ چیں ہے نہ چترِ قیصرِ روم — مزار و سایۂ نخلِ مزار باقی ہے
مثالِ آئینہ وا ہیں مزار میں آنکھیں — ہنوز حسرتِ دیدارِ یار باقی ہے

بہار آئی عجب حالت ہے ان روزوں مرے دل کی
جگر میں چٹکیاں لیتی ہیں منقاریں عنادل کی
حسینانِ جہاں رہتے ہیں مہماں عکس کی صورت
بنا ہے خشت آئینہ سے شاید خانۂ دل کی

دوسرا کون ہے جہاں تو ہے — کون جانے تجھے کہاں تو ہے
لاکھ پردوں میں تو ہے بے پردہ — سو نشانوں میں بے نشاں تو ہے
تو ہے خلوت میں تو ہے جلوت میں — کہیں پنہاں کہیں عیاں تو ہے
نہیں تیرے سوا یہاں کوئی — میزباں تو ہے میہماں تو ہے

جسم کہتا ہے جان ہے تو ہی　　جان کہتی ہے جانِ جاں تو ہے
رنگ تیرا چمن میں بو تیری　　خوب دیکھا تو باغباں تو ہے
محرمِ راز تو بہت ہیں امیر　　جس کو کہتے ہیں رازداں تو ہے

خم بھی رویا مجھے پیمانہ بھی رویا مجھ کو
جتنے تھے چھوٹے بڑے سب مرے ماتم میں رہے
اپنے بیگانے کو روتے ہی کٹی عمر امیر
کبھی دشمن کے کبھی دوست کے ماتم میں رہے

اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے　　ہم مرے جاتے ہیں تم کہتے ہو حال اچھا ہے
تجھ سے مانگوں نہ تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے　　سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے
خوب دیکھا تو جوانی کا ہے سارا جوبن　　حسن پریوں کا نہ حوروں کا جمال اچھا ہے
قوتِ عجز سے تا کنگرۂ عرش پہنچ　　رنگ پرواز کا یہ بے پر و بال اچھا ہے

پہچان پر ہے ناز تو پہچان جایئے　　کیا ہے ہمارے دل میں بھلا جان جایئے
رتبہ شہیدِ عشق کا گر جان جایئے　　قربان ہونے والے کے قربان جایئے
مانی ہیں میں نے سینکڑوں باتیں تمام عمر　　آج آپ ایک بات مری مان جایئے
اچھا ہوا کہ حضرتِ دل واں دھرے گئے　　کس نے کہا تھا بن کے نگہبان جایئے

وعدہ آنے کا ہے ان سے خواب میں　　خواب کب آتا ہے دیکھا چاہیے

قطع ہو راہِ سفر کوچۂ قاتل آئے | تھک گیا ہوں میں الٰہی کہیں منزل آئے
ہم تہی دست لبِ گور تو پہنچے پر یوں | جس طرح لٹ کے مسافر سرِ منزل آئے
مجھ سے صدمے نہ جدائی کے اٹھیں گے یارب | جان بھی ساتھ ہی جائے جو کہیں دل آئے
حال ہوشیاری کا بیدار دلوں سے پوچھو | ہم تو غافل گئے غافل رہے غافل آئے
یہ نیا قاعدہ دربار کا ٹھیرا ہے حضور | نذر کے واسطے ہر روز نیا دل آئے
بے نقاب آئے جو وہ رات کو محفل میں امیر | شمع نے بڑھ کے کہا رونقِ محفل آئے

کوچۂ وہم ہے تاریک، بھٹکنے کا ہے ڈر | چاہیے روشنئ شمعِ یقیں تھوڑی سی
ایک قطرہ بھی نہ پینا مگر اے جانِ جہاں | اسی انداز سے کہہ دے کہ نہیں تھوڑی سی
ہدیۂ دوست سمجھ کر میں ہوا شکر گزار | روکھی سوکھی جو ملی نانِ جویں تھوڑی سی

گلشن میں بلبلیں ہیں ہماری طرح سے مست | ساقی گلابیاں ہیں کہ قلمیں گلاب کی
موسیٰ کو یہ پڑی ہے کہ برقِ جمال تھی | اک تہ اتر گئی تھی تمہارے نقاب کی

مرے گھر کی طرف بھی عالم مستی میں آ نکلے | ترنگ ایسی کبھی یارب مزاجِ یار میں آئے

رکھنا نہ مجھ کو ساتھ دل بے قرار کے | ہو اور اک مزار برابر مزار کے

شیخ کعبہ میں برہمن دیر میں | سب ہیں درباری ترے دربار کے

ہم اس کے عشق میں صبر و قرار کھو بیٹھے | قدیم دوست ہمیشہ کے یار کھو بیٹھے
سوال وصل کا کرنے سے یہ ہوا حاصل | کہ آسرا ترے امیدوار کھو بیٹھے

وفا کا عہد کیا دے کے دل تو یہ پایا — کہ پھیر لینے کا بھی اختیار کھو بیٹھے
سرِ خدنگِ نگہ آچکا تھا طائرِ دل — تم آنکھ پھیر کے اپنا شکار کھو بیٹھے

جتنی کمی کہ نامہ سیاہی میں رہ گئی — اتنی ہی دیر عفوِ الٰہی میں رہ گئی
اللہ رے انقلاب محل ہے نہ قصر ہے — تربت فقط عمارتِ شاہی میں رہ گئی
پردے کو اس کی ذات سے کیا کام تھا امیر — چھپ کر صفاتِ لاتناہی میں رہ گئی

لگا چاہتی ہے کوئی آگ تازہ — شرارت سے ان کی حیا مل رہی ہے

وصل ہو جائے یہیں حشر میں کیا رکھا ہے — آج کی بات کو کیوں کل پہ اٹھا رکھا ہے
جان بھی ہجر میں دے دیتے مگر ہم نے امیر — کسی موقع کے لیے اس کو لگا رکھا ہے

مقابل آئینہ ہے آنکھ اٹھاؤ — ہنسو بولو کچھ اپنے ہم نشیں سے
یہ کس کا آستانہ ہے کہ سجدے — گرے پڑتے ہیں آغوشِ جبیں سے
صبا آتی ہے اٹھلاتی ہوئی آج — کوئی پیغام لائی ہے کہیں سے

آنکھوں کے آگے آ کے کھڑی ہوگئی وہ شکل — دم بھر جہاں پلک سے پلک آشنا ہوئی
ہے بخشنے نہ بخشنے میں اس کو اختیار — تو ہے گناہ گار کہے جا خطا ہوئی
گھبرا رہے ہو حشر میں کیوں اس قدر امیر — اتنی ہی سی تو بات ہے کہہ دو خطا ہوئی
غافل نزول ہی تو کمالِ عروج ہے — خاکِ فنا ہی منزلِ آبِ بقا ہوئی
نقطہ کی سیر دائرۂ معرفت میں دیکھ — تھی ابتداء جہاں سے وہیں انتہا ہوئی

لامکاں کے جو کتابوں میں لکھے ہیں اوصاف ملتے جلتے ہیں وہ کچھ کچھ مرے ویرانے سے
ذکرِ ہُو، کس دلِ وحشی نے کیا ہے کہ امیر وہی آواز چلی آتی ہے ویرانے سے

فسانہ رہ گیا حسن و محبت کا زمانے میں
نہ مجنوں ہے نہ لیلیٰ ہے نہ ناقہ ہے نہ محمل ہے
طنابیں کھینچ دے یارب زمینِ کوئے جاناں کی
کہ میں ہوں ناتواں اور دن ہے آخر دور منزل ہے
امیرِ خستہ جاں کی مشکلیں آسان ہوں یارب
تجھے ہر بات آساں ہے اسے ہر بات مشکل ہے
اسی جوہر سے ہے ہر دل عزیز آئینہ دنیا میں
اسی کی شکل بن جاتی ہے یہ جس کے مقابل ہے

ہزار برق نے چل پھر کے مشق کی لیکن ادا نہ آئی ترے مسکرا کے آنے کی
گھٹا میں برق جو چمکی تو یاد آئی امیر ادا کسی کی وہ پردہ اٹھا کے آنے کی

بالائے آسماں تھے ہم عرش آشیاں تھے کوئی نہ تھا وہاں تھے اب کیا کہیں کہاں تھے
خاموش ہیں لحد میں جو لوگ خوش بیاں تھے غنچوں کے جو دہن تھے بلبل کی جو زباں تھے
دیکھا خزاں میں ہم نے بلبل کے آشیاں کو دو چار پر شکستہ دو چار استخواں تھے
پہنچے جو ہم عدم کو اہلِ حرم یہ بولے مدّت کے بعد آئے اتنے دنوں کہاں تھے

دل کو اب کب قرار آتا ہے سن لیا ہے کہ یار آتا ہے
چین آتا نہیں مزار میں آج کون سوئے مزار آتا ہے

تم کو آتا ہے پیار پر غصہ مجھ کو غصے پہ پیار آتا ہے

دل اگرچہ غم سے فگار ہے مگر اب بھی باغ و بہار ہے
اسی شاخ کا یہ شعار ہے کہ شکستہ ہو کے ہری رہی
جو بڑے بڑے تھے جہاں کشاں انھیں کیا فلک نے مٹا دیا
نہ عروجِ چترِ شہی رہا نہ ضیائے تاجِ زری رہی

میں ہوں وہ عندلیب ہوا جب ترانہ سنج جتنے کھلے تھے گل ہمہ تن گوش ہو گئے
ساقی شراب اور خراباتیوں کو دے ہم تیری چشمِ مست سے مدہوش ہو گئے
مدّت سے سر امانتِ شمشیرِ یار تھا ہم ذبح ہو کے آج سبکدوش ہو گئے

دل میں تم آنکھ میں تم کعبہ میں تم دیر میں تم تم جہاں چاہو چھپو ہم تمھیں پہچان گئے
حق شناسی کی حقیقت کو انھی نے جانا اے امیر اپنی حقیقت کو جو پہچان گئے
وحشتوں کے وہ کہاں لطف اسیری میں امیر اب وہ میدان وہ سنسان بیابان گئے

امیر روتی ہے اُمت شہ زماں کے لیے زمین خاک اڑاتی ہے آسماں کے لیے
غضب کی لاگ تھی کمبخت برق کو مجھ سے چمن کو پھونک دیا ایک آشیاں کے لیے
کمر لچکتی ہے خنجر سنبھل نہیں سکتا اور آپ آئے ہیں عاشق کے امتحاں کے لیے
حضور اس کے ہیں دشمن بہت اجازت ہو تو پاسبان بنوں شب کو پاسباں کے لیے

چمن میں جا کے یہ گل رونئی چالیں دکھاتے ہیں
گلوں سے تن کے چلتے ہیں اکڑتے ہیں صنوبر سے

یہ روز و شب نہیں کٹتے ہیں غافل زندگانی کے
نکل جاتا ہے ہر روز اک دو ورقہ تیرے دفتر سے

مشتاق سے دور بھاگتی ہے کتنی ہے اجل میں خو تمہاری
آنکھوں سے کہو کمی نہ کرنا اشکوں سے ہے آبرو تمہاری

جتنے کہ تیر ترکشِ دلبر میں رہ گئے اتنے ہی حوصلے دلِ مضطر میں رہ گئے

قبلۂ دل کعبۂ جاں اور ہے سجدہ گاہِ اہلِ عرفاں اور ہے
ہو کے خوش کٹواتے ہیں اپنے گلے عاشقوں کی عیدِ قرباں اور ہے
روز و شب یاں ایک سی ہے روشنی دل کے داغوں کا چراغاں اور ہے

لے چلی غربت جو صحرا کی طرف مل کے ہم روئے در و دیوار سے
تھے وہ موسیٰ غش پہ غش آیا جنھیں یاں تو آنکھیں کھل گئیں دیدار سے

دیر میں کون ہے کعبے میں گزر کس کا ہے یار کا گھر یہ اگر ہے تو وہ گھر کس کا ہے
تیر پر تیر لگاؤ تمھیں ڈر کس کا ہے دل یہ کس کا ہے مری جان جگر کس کا ہے

نہ زر سے کام نہ احباب سے نہ دولت سے یہ سب رہیں نہ رہیں عالم شباب رہے
خدا کا نور چھپانے سے چھپ نہیں سکتا جہاں رہے وہ عیاں مثلِ آفتاب رہے

ہمہ تن فکر ہوں میں فکرِ غزل کیا ہو امیر شعر گوئی نہیں خاطر ہے فقط یاروں کی

اک ذرا وحشتِ دل بڑھ کے خبر تو لینا خاک کیا نجد میں مجنوں نے اڑا رکھی ہے

عدم میں کیا تماشہ ہے کہ دن رات چلی جاتی ہے سب خلقت خدا کی
دکھے کیونکر نہ دل آوازِ نے سے صدا ہے یہ کسی درد آشنا کی

ہمیں سر پٹکتے ہی گزری امیر یوں ہی عمر ساری بسر ہوگئی

بدقت ہجر و غم سے کشتی جانِ حزیں نکلی کہیں بیٹھی، کہیں اُچھلی، کہیں ڈوبی، کہیں نکلی
زمانہ ہوگیا موجود جس دن ہاں کہا تو نے ہوا نابود عالم جب ترے منہ سے نہیں نکلی
تعلّی میں کمی کی کب ہماری طبعِ عالی نے بنایا آسماں جب شعر کی کوئی زمیں نکلی

دل میں آکر نہ دل سے پھر نکلے تم تو ارمان بن گئے دل کے

نگاہِ لطف بھی خالی نہیں ہے شوخی سے کسی ادا کو تو رکھ چھوڑیے حیا کے لیے
یہ کس کے وصل کی ہے آرزو کہ یاس بھی اب دعائیں مانگ رہی ہے مری دعا کے لیے
امیر کعبہ کو جاتا ہوں میں تو دیر سے بت پکارتے ہیں ادھر بھی ذرا خدا کے لیے

باقی ہے امیر اب تو فقط جان کا جانا ہوش و خرد و تاب و تواں جا چکے کب کے
قرآن میں امیر آئے ہیں حوروں کے جو اوصاف در پردہ وہ انداز ہیں سب حسنِ طلب کے

تمھاری ایک نظر میں تو کام ہوتا ہے　　بس اک گھڑی کے لیے آؤ عمر بھر نہ سہی

دم اخیر تو ظالم ذرا نگاہ ملے　　کچھ اس غریب مسافر کو زادِ راہ ملے
امیر میکدہ معرفت کو یوں جاویں　　کہ راہ میں کوئی مسجد نہ خانقاہ ملے

رہنے دو تم ابھی دیوان کو چھانٹو نہ امیر　　آپ چھٹ جائیں گے جو شعر ہیں چھٹنے والے

رہنے کب دنیا میں آئے تھے امیر　　سیر کر لی اور اپنے گھر چلے

حجابِ نور ایسا درمیاں ہے　　عیاں ہو کر وہ آنکھوں سے نہاں ہے

کیسی راہِ عدم آباد ہے ہموار امیر　　چین سے سوتے چلے جاتے ہیں جانے والے

ہم کو ہستی میں غریب الوطنی لائی ہے　　اصل میں ہیں عدم آباد کے رہنے والے
سادہ سمجھو نہ انھیں رہنے دو دیواں میں امیر　　یہی اشعار زبانوں پہ ہیں رہنے والے

دیکھ لے گا مری حالت جو محبت میں تو پھر　　کوئی کمبخت ہی ہوگا جسے الفت ہوگی
کبھی آئے گا وہ دل میں کبھی آنکھوں میں امیر　　یہی خلوت مری ہوگی یہی جلوت ہوگی

عکسِ آئینہ سے یہ ظاہر ہے　　تو ہی اوّل ہے تو ہی آخر ہے
کوئی مہماں سرا ہے یہ دنیا　　جو ہے اس گھر میں وہ مسافر ہے

یہ کس بیدرد کس ظالم پہ اپنا دم نکلتا ہے
یہ رہ رہ کر کلیجہ چٹکیوں سے کون ملتا ہے
عجب تقدیر پائی ہے امیر اس دار دنیا نے
نہیں آتا پھر اس گھر میں جو اس گھر سے نکلتا ہے

کونین میں ہے جلوۂ حسن جمالِ دوست
ہے ایک روشنی کہ ادھر بھی ادھر بھی ہے

سوا خورشید رویوں کے کسی پر میں نہ مائل ہوں
الٰہی دے مجھے ذرّے کا رُتبہ آنکھ شبنم کی

قبولِ خاطرِ روشن دلاں اگر ہوتے
امیر نور کے سانچے میں شعر ڈھل جاتے

بے خود ایسا ہوں کسی کی لذتِ تقریر سے
پہروں کرتا ہوں خموشی کا گلہ تصویر سے

بیعتِ پیر مغاں طرفہ مزا دیتی ہے
سلسلہ ساقیٔ کوثر سے ملا دیتی ہے
کیجئے غور تو دولت بھی پیمبر ہے امیر
کہ امیروں کو خدا سے یہ ملا دیتی ہے

طالبِ مرگ بھی ہیں منتظرِ یار بھی ہیں
دیکھیے کون شبِ ہجر میں اوّل آئے

ہم ترے کشتۂ رفتار ہیں کیا ہم کو خبر
کب پھنکا صور کب اے یار قیامت آئی

شب کو ہوتا ہے جو بے پردہ
چاندنی سیرِ بام کرتی ہے

کشتیٔ عمر کا انجام ہمیں یاد آیا
کھا کے چکر کوئی کشتی جو کہیں بیٹھ گئی

پایا کسی نے سرِ محبت نہ آج تک　　افسانہ عشق کا خبرِ نارسیدہ ہے

خدا ہمت اگر دیتا تو اپنے قتل کی چالیں　　کسی قاتل کو سکھلاتے کسی خنجر کو سمجھاتے

آتا نہیں نظر کچھ گو سامنا ہے اس کا　　کیا بیچ میں تحیر پردہ کیے ہوئے ہے

شاعر ہیں اس زمانے کے دریوزہ گر امیر　　نکلے ہیں بھیک مانگنے دیواں بغل میں ہے

کہاں دیر و حرم میں عشق مشرب　　یہ لوگ آزاد ہیں قیدِ مکاں سے

گھڑیوں روئے ہیں ہم امیر لہو　　زخم کوئی جو مسکرایا ہے

ہزار طوطی و بلبل نے مشق پیدا کی　　نہ اُس کو آئی نہ اِس کو مری زباں آئی

خاکی نژاد خاک کے اندر چلے گئے　　جس گھر سے آئے تھے اسی گھر میں چلے گئے

کھلتا نہیں کہ اس کے کوچہ کا کیا پتا ہے
میں دل سے پوچھتا ہوں دل مجھ سے پوچھتا ہے

بڑھ جاتی ہے چمن میں اور آرزو تمہاری　　جس گل کو سونگھتا ہوں آتی ہے بو تمہاری

بجلی کی طرح پھرتی تھی محفل میں کوندتی
کیا کہیے وہ نگاہ کدھر تھی کدھر نہ تھی

لاکھ بار اُٹھتا ہے پر جاتا نہیں
درد شاید میرے دل میں قید ہے

ہستی و نیستی کا کھلتا نہیں ہے عقدہ
آتے ہیں کچھ اُدھر سے جاتے ہیں کچھ اِدھر سے

مکاں سے سوئے لامکاں لے گئی
یہ وحشت کہاں سے کہاں لے گئی

عشق سے پیری میں بھی کچھ لاگ باقی رہ گئی
کاروانِ عمر گزرا آگ باقی رہ گئی

جانِ سمندر و دلِ پروانہ دے مجھے
اے سوزِ عشق ہمتِ مردانہ دے مجھے

جاری ہے لین دین یہ رسم زمانہ ہے
دریا کا ابر، ابر کا دریا خزانہ ہے

سپاہِ اشک کی آنکھوں نے کی ہے تیاری
کہو کہ نیزۂ مژگاں کرے عمل داری
عدم کو جاتے ہیں ہستی سے قافلے کیا کیا
یہ شاہراہ شب و روز رہتی ہے جاری
اِدھر جو تیر اُدھر تن پہ تیغ پڑتی ہے
کہاں کہاں کی بھلا ہو سکے خبرداری
ادھر مکان بنا اور ادھر مزار کھدا
ادھر لباس ادھر ہے کفن کی تیاری
وہ خوش خرام ہوئے خاک جن کے ماتم میں
زمیں پہ سر کو پٹکتے ہیں کبکِ کہساری
لحد میں ان پہ پڑا بوجھ سینکڑوں من کا
کسی کی جن سے نہ ہوتی تھی ناز برداری
کہاں وہ ذکر زلیخا، کہاں وہ شاہیٔ مصر
کہاں وہ حضرتِ یوسف کی گرم بازاری

یہی حقیقت دنیا ہے گر تو کیا دنیا کسی سے کی، نہ کرے گی کبھی وفاداری
مسافر اس میں روانہ ہیں آنکھ بند کیے عدم کی راہ میں دیکھو ہے کتنی ہمواری

مسکرایا وہ اس ادا سے امیر میں تو سمجھا کڑک گئی بجلی

کس رئیس کی محفل کا ذکر کیا ہے امیر خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بن بلائے ہوئے

کچھ رہے یا نہ رہے پر یہ دعا ہے کہ امیر نزع کے وقت سلامت میرا ایمان رہے

تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی یا رب بجھے گی آگ یہ کیونکر لگی ہوئی
لاؤ تو قتل نامہ ذرا میں بھی دیکھ لوں کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی
جائیں گے تیرے کوچہ میں ہم کس امید پر کافی ہے ہم کو پہلی ہی ٹھوکر لگی ہوئی
اُلفت کا جب مزا ہے کہ وہ بھی ہوں بیقرار دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی
کچھ خوف روزِ حشر ہے دل میں ترے امیر ہے زندگی سے موت برابر لگی ہوئی

عادت تو امیر اچھی ہے فریاد و فغاں کی پر شیوۂ تسلیم و رضا اور ہی کچھ ہے

اے پری اس فصل میں سرگرم آرائش نہ ہو
آگ تلوؤں میں لگاتی ہے حنا برسات کی
ابر، دریا، سبزہ، ساقی، یار، مطرب، دختِ رز
ہو یہ سب ساماں تو پھر دیکھیں فضا برسات کی

شیرۂ انگور کو کرتی ہے آبِ آتشیں
آگ پانی میں لگاتی ہے ہوا برسات کی

رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں نو عروسانِ چمن
پتے پتے سے ٹپکتی ہے ادا برسات کی

زاہدوں کی توبہ ٹوٹی لڑکھڑایا پائے شیخ
کچھ عجب مستانہ رُت ہے ساقیا برسات کی

پتے پتے پر ہے ساقی سبزۂ مینا کا رنگ
کیا نظر آتی ہے سبزی خوش نما برسات کی

میکشوں کے منہ سے جو اس فصل میں نکلی دعا
لے اُڑی بابِ اجابت کو ہوا برسات کی

ہر روش پر ہو چمن میں اک پری ساغر بکف
ایک دن یوں دیکھیں اے ساقی فضا برسات کی

ہجر میں سب بے مزہ ہے وصل میں سب بامزہ
فصل گرمی کی ہو یا جاڑے کی یا برسات کی

جب چمن میں آگیا مستوں کو ساون کا خیال
ساونی گاتی ہوئی آئی گھٹا برسات کی

کیا تری زلفِ سیہ کو دیکھ کر شرما گئی
بھیگی بھیگی رات ہے اے مہ لقا برسات کی

عشق

محیطِ زمین و زماں عشق ہے
زمیں عشق ہے آسماں عشق ہے

محبت کا دریا بلاخیز ہے
جو موج اس کی ہے تیغِ خونریز ہے

کہوں کیا میں طوفاں بڑا فرق ہے
یہاں کشتیٔ نوح بھی غرق ہے

بڑھی بیقراری حجاب اُڑ گیا
عجب خواب تھا جس سے خواب اُڑ گیا

چھپائے سے چھپتا ہے کب رازِ عشق
کہ بے زخمہ بجتا ہے خود سازِ عشق

یہ وارفتۂ شوقِ دیدار تھے
تجلی کے موسیٰ طلبگار تھے

سنا نامِ بلقیس حیراں ہوئے
جو دیکھا تو عاشق سلیماں ہوئے

عجب عاشقی کے ہیں راز و نیاز
کہ محمود ہے خود غلامِ ایاز

ہوا نل یہ محو ہوائے دمن
کہ پوچھا نہ پھر کچھ سوائے دمن

جہاں شمع ہے گردِ پروانہ ہے
پری کو جو دیکھا ہے دیوانہ ہے

گلوں پر ہے یوں بلبلوں کا ہجوم
قمر پر ہو جیسے ہجومِ نجوم

کبھی نافۂ چینِ گیسو بنا
کبھی سرمۂ چشمِ جادو بنا

زباں تیز منصور کے کام میں
مئے تند جمشید کے جام میں

کھنچی اس کی شمشیر خوں ہوگیا
پڑا اس کا سایہ جنوں ہوگیا

کہیں کارفرما کہیں کارساز
کہیں روح فرسا کہیں جاں گداز

کہیں خندہ زن خندۂ گل کے ساتھ
کہیں نالہ کش آہِ بلبل کے ساتھ

کہیں شانۂ موئے آشفتگاں
کہیں بیشتر راحتِ خفتگاں

تہِ پردۂ چشم برق جلال
حسینوں کے چہرے پہ نورِ جمال

تغیر کبھی ہے بحالی کبھی
لبالب کبھی ہے تو خالی کبھی

سرِ راہ بیٹھا کہیں بن کے گرد	کسی دل میں اٹھا کہیں ہو کے درد
کہیں شام سے کوئی روتا رہا	کوئی شب کو سوتے کا سوتا رہا
کسی ماہ کا یہ قرینہ کیا	گلوں کی طرح چاک سینہ کیا
کوئی مہر قید محن میں پھنسا	کوئی ماہ طلعت گہن میں پھنسا
غرض یہ طلاطم ہے ہر لہر میں	یہ آشوب برپا ہے ہر شہر میں
ہوئے اس کے ہاتھوں بہت گھر خراب	کیے اس نے کشور کے کشور خراب

مثنوی

اسی کا یہ جلوہ ہے چاروں طرف
ہزاروں نشاں ہیں ہزاروں طرف

وہ اوّل کہ جس کی نہیں حد کہیں
وہ آخر کہیں جس کا آخر نہیں

زمانے میں سب کچھ ہے الاشریک
وہی ہے وہی وحدہٗ لاشریک

اسی ایک نے سب کو پیدا کیا
یہ سب کارخانہ ہویدا کیا

یہ نیرنگیاں لاأبالی نہیں
کوئی پردہ نغمے سے خالی نہیں

یہ سب پردۂ ساز اسرار ہیں
صدا ایک ہے سینکڑوں تار ہیں

سوا اس کے کوئی یگانہ نہیں
ہمیشہ وہی ہے زمانہ نہیں

جہاں پر توِ نورِ جانانہ ہے
یہ محفل نہیں آئینہ خانہ ہے

جو مطرب نوازندۂ ساز ہے
ہر اک ساز میں اس کی آواز ہے

توافق تخالف میں پایا گیا
عجب ایک ساگر بنایا گیا

رہِ فہم دل بھولتا ہی نہیں
شناور کا دم پھولتا ہی نہیں

چمن پر ہی موقوف ہے کیا فضا
کہ ہر بزم میں اک چمن ہے بپا

ہوا زلف و رُخ کا برابر ظہور
کہ بے سایہ ممکن نہ تھی قدر نور

زہے صنعتِ خالقِ روز و شب
جدھر دیکھیے ہے تماشہ عجب

نہالوں کو ایسا سرِ معرفت
کہ ہے ہر ورق دفترِ معرفت

پری رو سمن سینہ نازک بدن
قدر است شمشاد و غنچہ دہن

اسی کا ہے جلوہ سجاتا سمک
اسی کا ہے پرتو زمیں تا فلک

وہی مادہ اور وہی صلب سنگ
تماشائے قدرت ہے تبدیل رنگ

ریاحیں ہوں یا نخلِ لیل و نہار اُسی سے ہیں رحمت کے امیدوار
کسی سر پہ تاجِ شہی دھر دیا کسی سنگ کو آئینہ کر دیا
شجر ایک گل ہائے تو نو بنو نہال ایک اس کے ثمر نو بنو

واسوخت

دھوم ہے خسروِ اقلیمِ جنوں آتا ہے　　فوجِ غم ساتھ ہے آمادۂ خوں آتا ہے
خلل اندازِ صفِ صبر و سکوں آتا ہے　　صاحبِ لشکرِ نیرنگ و فسوں آتا ہے
قابلِ دید تماشہ حشم و جاہ کا ہے
داخلہ تخت گہِ دل میں شہنشاہ کا ہے

وہ فلک قدر شہنشاہِ زمن کون؟ کہ عشق　　تیغ زن تیر فگن قلعہ شکن کون؟ کہ عشق
رستمِ معرکۂ رنج و محن کون؟ کہ عشق　　مالکِ ملکِ دل و جان و بدن کون؟ کہ عشق
گرد میں ہے روشِ بادِ بہاری دیکھو
حضرتِ عشق کی آتی ہے سواری دیکھو

حسرتیں کشتہ ہیں جس کی وہ ستم گر ہے یہی　　پہلواں جس نے پچھاڑے وہ دلاور ہے یہی
ڈوبتے جس نے نکالے وہ شناور ہے یہی　　کشتیاں جس نے ڈبوئیں وہ سمندر ہے یہی
خضر کا غرق ہے یاں آج نہیں کل بیڑا
نوح لائیں جو سفینہ نہ لگے تھل بیڑا

عشق عشاق کو رسوائے جہاں کرتا ہے　　صاحبِ ضبط کو سرگرمِ فغاں کرتا ہے
چشمۂ چشم سے سیلاب رواں کرتا ہے　　زرد چہرہ صفتِ برگِ خزاں کرتا ہے
نوجواں خم صفتِ پیرِ کہن سال ہوئے
سینکڑوں باغِ جوانی تھے جو پامال ہوئے

دل لگاتے ہی ہزاروں کو پڑی جانوں کی　　سینکڑوں چھان چکے خاک بیابانوں کی
دھجیاں اُڑ گئیں کیا کیا نہ گریبانوں کی　　جس جگہ دیکھیے ٹکڑی ہے پریشانوں کی
کچھ عجب بزم ہے یہ لوگ جہاں ہوتے ہیں
چار سر پھوڑتے ہیں چار کھڑے روتے ہیں

پھاڑ کر کپڑے ہوئے جامے سے باہر کتنے چھان کر خاک ہوئے خاک برابر کتنے
تشنہ لب ڈوب مرے چاہ میں گر گر کتنے غرقِ دریا ہوئے تھک کے شناور کتنے
دب رہا کوئی سیہ خانۂ زنداں کے تلے
کوئی روتا ہے کسی نخلِ بیاباں کے تلے

بحد جوشِ جنوں سلسلۂ جنباں پھر ہے الاماں خاطرِ ناشاد پریشاں پھر ہے
دامنِ وادیِ وحشت میرا داماں پھر ہے جادۂ دشت مرا چاک گریباں پھر ہے
موج اشکوں کی نظر آتی ہے زنجیر مجھے
پیچ تقدیر کا ہے طوق گلوگیر مجھے

کشوروں میں جہاندار ہوا خسروِ عشق مالکِ دولتِ بیدار ہوا خسروِ عشق
رونق افزا، سرِ دربار ہوا خسروِ عشق تاج کا تخت کا مختار ہوا خسروِ عشق
نام خطبے میں کیا شاہ نے اپنا جاری
کشورِ دل میں ہوا داغ کا سکہ جاری

خواہشِ جلوۂ معشوق ہوئی پہلو کو حسرتِ زانوئے محبوب ہوئی زانو کو
دھیان آیا دلِ سودا زدہ گیسو کو سونگھنے چل کے کسی کاکلِ عنبر مو کو
عمر بے صحبتِ محبوب کٹے خوب نہیں
زیست کا لطف بجز صحبتِ محبوب نہیں

رباعیات

گھر کُھدنے کی پوچھو نہ مصیبت ہم سے　　ملتی ہے لپٹ لپٹ کر حسرت ہم سے
یا ہم جاتے تھے گھر سے رخصت ہو کر　　یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے

شُہرے کرمِ پیرِ خرابات کے ہیں　　جلسے وہیں رندانِ خوش اوقات کے ہیں
منکر تھے مگر یہ ذکر سنتے سنتے　　زہاد بھی مشتاق ملاقات کے ہیں

خواہانِ طرب ہے جسے ادراک نہیں　　آرام تہِ گُنبدِ افلاک نہیں
پیمانۂ گردوں میں کہاں بادۂ عیش　　جز دردِ تہِ جام یہاں خاک نہیں

ظاہر میں جو آزردہ تمھیں پاتا ہوں　　کچھ دل میں نہیں دل کو یہ سمجھاتا ہوں
ہوتا ہے کبھی اگلی محبت کا اثر؟　　سچ کہہ دو کبھی میں تمھیں یاد آتا ہوں

امیر مینائی

الفاظ کی مناسبت، خیالات کی بلندی، نکات کی برجستگی، اشارات کی شوخی، بیان کی صفائی، الغرض وہ کونسی خوبی ہے جو امیرِ قلمروِ سخن کے کلام میں نہیں۔ پھر اس پر تصوف اور اخلاق کی چاشنی سونے پر سہاگا اور طعام میں نمک کا کام دیتی ہے۔ — لالہ سری رام

امیر کی شعر فہمی و سخن سنجی کے متعلق تو اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ''خاتم الشعراً'' تھے۔

— ممتاز علی آہ

ان کا کلام اعلیٰ خیالات، فصاحت و بلاغت، روانی و سلاست، توازنِ الفاظ اور ایجاز کے لیے مشہور ہے۔ ان کے اشعار میں شگفتگی، نزاکتِ خیال، بلند پروازی، شیرینی، زور اور قادر الکلامی بدرجۂ احسن موجود ہے۔ — رام بابو سکسینہ

امیر کا اصلی مذاق صوفیانہ تھا۔ آپ کا کمال غزلوں اور قصیدوں سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے۔ اردو شاعری میں نعت کا جس قدر مرتبہ آپ کے کلام کو حاصل ہے کسی کو میسر نہیں۔

— نصیر الدین ہاشمی

امیر کا کلام متقدمین کے مقررہ ضوابط اور اصولوں پر پورا اترتا ہے۔ حشو و زوائد سے پاک ہے اور شروع سے آخر تک متین اور سنجیدہ ہے۔ بعض اشعار میں جہاں شوخی پیدا ہوگئی ہے وہاں بھی پیرایۂ بیان شائستہ اختیار کیا ہے۔ — ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

حضرت امیر دبستانِ لکھنو کے آخری استاد تھے۔ انھوں نے قدیم لکھنوی شاعری کی روایات سے انحراف کر کے ایک نیا اور منفرد رنگِ شاعری ایجاد کیا، جس میں لکھنو و دہلی اسکول کی خصوصیات کا بہترین امتزاج ملتا ہے۔ — عرفان عباسی

ISBN 978-0-19-906692-6

9 780199 066926

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

www.oup.com
www.oup.com/pk

RS 135